تحقیقی زاویے

شمارہ:۱ جنوری۔جون ۲۰۱۳

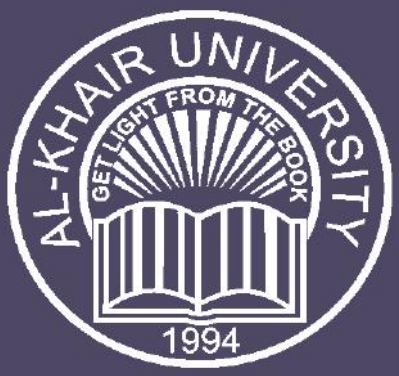

شعبہ اُردو و پاکستانی زبانیں

الخیر یونیورسٹی بھمبر

کیمپ آفس

آئی جے پی روڈ، بالمقابل آئی ایٹ گرڈ اسٹیشن، اسلام آباد

ISSN 2309-0499

تحقیقی وتنقیدی مجلہ

تحقیقی زاویے

۱

(جنوری۔جون2013ء)

شعبۂ اردو و پاکستانی زبانیں
الخیر یونیورسٹی، بھمبر
کیمپ آفس
آئی جے پی روڈ اسلام آباد

ISSN2309-0499

سرپرست: ڈاکٹر محمد بشیر گورایا، پرو چانسلر

نگران: ڈاکٹر اے۔ کیو۔ انصاری، ریکٹر

پبلشر: پروفیسر محمد امتیاز اقدس، وائس چانسلر

مجلس ادارت: ڈاکٹر انعام الحق جاوید، ڈین فیکلٹی آف سوشل سائنسز

ڈاکٹر رشید امجد، صدر شعبہ اردو و پاکستانی زبانیں

مجلس مشاورت (قومی)

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، پروفیسر ایمریطس، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر تبسم کاشمیری، وزیٹنگ پروفیسر، جی سی یونیورسٹی، لاہور

ڈاکٹر محمد فخر الحق نوری، صدر شعبہ اردو، یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

ڈاکٹر روبینہ ترین، ڈین و صدر شعبہ اردو، بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

ڈاکٹر محمد یوسف خشک، صدر شعبہ اردو، شاہ لطیف یونیورسٹی، خیر پور (سندھ)

ڈاکٹر نجیب جمال، صدر شعبہ اردو، انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر، صدر شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر روبینہ شہناز، صدر شعبہ اردو، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

ڈاکٹر ناہید قمر، شعبہ اردو، وفاقی اردو یونیورسٹی، اسلام آباد

مجلس مشاورت (بین الاقوامی)

ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ انڈیا

پروفیسر قاضی افضال حسین، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ انڈیا

ڈاکٹر صغیر افراہیم، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، انڈیا

ڈاکٹر محمد کیومرثی، صدر شعبہ اردو، تہران یونیورسٹی، ایران

ڈاکٹر جلال سوئیدان، شعبہ اردو، انقرہ یونیورسٹی، ترکی

ڈاکٹر سہیل عباس، شعبہ مطالعاتِ خارجی، ٹوکیو یونیورسٹی، جاپان

رابطے کیلئے: شعبہ اردو و پاکستانی زبانیں، الخیر یونیورسٹی

آئی جے پی روڈ، بالمقابل آئی ایٹ گرڈ اسٹیشن، اسلام آباد

برقی پتہ: tzurdu@hotmail.com **ویب سائٹ:** www.alkhair.edu.pk

سرکولیشن انچارج: محمد ساجد نظامی۔ اصغر عابد

سرورق: ذوالفقار احمد **ترتیب و تزئین:** محمد ابرار صدیقی۔ محمد علی

ISSN2309-0499

ترتیب

ابتدائیہ

◆ علمیات اور زبانوں میں تحقیق	ڈاکٹر عطش درانی	۷
◆ دبستان سیال شریف کا ملفوظاتی ادب: ایک تعارفی مطالعہ	ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر	۱۷
◆ اردو میں مغربی تنقید کی نصابی کتب	ڈاکٹر ناصر عباس نیر	۲۷
◆ اُردو نصاب: آزادی سے پہلے	ڈاکٹر سہیل عباس	۴۳
◆ نفاذ اُردو کے لیے قانون سازی (۱۸۹۷ء- ۱۹۹۷ء)	ڈاکٹر محمد ارشد اویسی	۶۱
◆ اُردو شاعرات ۱۸۵۷ء سے پہلے: ایک نسوانی تاریخ	ڈاکٹر محمد اشرف کمال	۷۷
◆ جمالیات کیا ہے؟	ڈاکٹر رابعہ سرفراز	۹۱
◆ اردو میں مضمون نگاری کی روایت	سید کامران عباس کاظمی	۹۹

☆☆☆

◆ منٹو کی وجودی اخلاقیات	ڈاکٹر تبسم کاشمیری	۱۱۱
◆ ادب اور بقائے باہمی : تین کہانی کار (کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین)	ڈاکٹر قاضی عابد/ڈاکٹر محمد افضال بٹ	۱۱۵
◆ "ایک پہاڑ اور گلہری" کا غیر مطبوعہ منظوم پنجابی ترجمہ از صوفی تبسم	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	۱۳۰
◆ نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں تہذیب و ثقافت کی عکاسی	میمونہ سبحانی	۱۳۸
◆ دبستانِ تحقیق لاہور کا روشن ستارہ حافظ محمود شیرانی	ڈاکٹر محمد افضال بٹ	۱۴۸

☆☆☆

◆ انڈیکس	محمد ساجد نظامی	۱۵۶

مقالہ نگاروں سے درخواست

☆ مطبوعہ مقالات نہ ارسال کیے جائیں اور ایک ہی مقالہ مختلف جرائد میں نہ بھجوائیں۔

☆ مقالہ بھیج کر چھپنے یا نہ چھپنے کی اطلاع کا انتظار کریں۔ ایچ ای سی کے جرائد میں مقالات کی اشاعت کے کئی مراحل ہیں، خصوصاً 'Peer Review' جس میں تاخیر ہوسکتی ہے۔ اس دوران اگر مقالہ کسی دوسرے جریدے کو بھیج دیا جائے تو اس سے دونوں جرائد کے ساتھ خود سکالر کی ساکھ بھی متاثر ہوتی ہے۔

☆ حوالہ جات/حواشی/تعلیقات اندر لکھی گئی ہدایات کے مطابق دیے جائیں۔

☆ مقالہ کے اردو عنوان کے ساتھ عنوان کا انگریزی ترجمہ بھی درج کریں نیز اپنا نام/عہدہ/ پتہ اُردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی لکھیں۔

☆ انگریزی میں Abstract طویل نہ ہو نیز ایک الگ صفحے پر اس کا اردو ترجمہ بھی لکھ کر ارسال کریں۔

☆ اپنے مقالے کا اشاریہ (نام، کتب، مقامات، ادارے وغیرہ) بھی بنائیں۔

ابتدائیہ

اختلاف تحقیق وتنقید کو نکھارتا اور معیاری بناتا ہے لیکن اختلاف شخصی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس سے ادبی گروہ بندی اور سیاست جنم لیتے ہیں اسی لیے کہتے ہیں کہ شخصی اختلاف جھگڑے اور تنازع کا سبب بنتا ہے لیکن اگر اختلاف نیک نیتی سے کیا جائے تو باعث برکت ہے کہ اس سے بحث کے نئے نئے رخ سامنے آتے ہیں اور ایسے نئے دروازے کھلتے ہیں جن سے حقیقت اور سچ کی تہ تک پہنچنے کے راستے سامنے آتے ہیں۔ ہم اپنی ادبی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی اختلاف شخصی نوعیت کے ہوئے گروہ بندیوں نے جنم لیا اور بعض اوقات تو اس سے عملاً لڑائی جھگڑے کی صورتیں بھی پیدا ہوگئیں جن سے شخصی اناؤں کو تو ضرور تقویت ملی مگر بحیثیت مجموعی تخلیقی رفتار و معیار کو نقصان ہوا لیکن دوسری طرف جب اختلاف شخصی حدوں سے نکل کر نظریاتی یا فکری سطحوں پر کیا گیا تو تخلیقی عمل کا ایسا تنوع پیدا ہوا جس سے مقدار و معیار دونوں میں بہترین صورتیں پیدا ہوئیں۔ اختلاف یکسانیت کو توڑتا ہے۔ ماوزے تنگ کا قول ہے کہ باغ میں سو پھولوں کو کھلنے دو تاکہ باغ کی بہار اور رنگا رنگی قائم رہے۔ نئے نئے ادبی رویے اور تحریکیں اختلاف ہی کا نتیجہ ہیں، چنانچہ ادبی وفکری اختلاف کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں لیکن بنیادی بات یہی ہے کہ اس کی نوعیت شخصی نہیں ہونا چاہیے۔

الخیر یونیورسٹی کے ''شعبہ اردو و پاکستانی زبانیں'' کی طرف سے سے ایک تنقیدی و تحقیقی مجلّے کا اجرا کیا گیا ہے۔ جامعات کے تحقیقی معیار میں تحقیقی جریدہ اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس سے نہ صرف جامعہ کے اساتذہ اور ریسرچ سکالرز استفادہ کرتے ہیں بلکہ دوسری جامعات سے بھی ان کا رابطہ قائم ہوتا ہے۔ یہ ''تحقیقی زاویے'' کا پہلا شمارہ ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ایچ ای سی (پاکستان) کے معیار اور ہدایات کی روشنی میں ایسا جریدہ شائع کیا جائے جو لکھنے والوں کو ایک معیاری پلیٹ فارم فراہم کرے۔

ہم ان تمام مقالہ نگاروں کے شکر گزار ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر اپنے مقالے عطا کئے۔ ان اہل علم دوستوں کے بھی ممنون ہیں جنھوں نے مجلس مشاورت میں شرکت کی دعوت کو قبول کیا۔ ''تحقیقی زاویے'' سال میں دو بار شائع ہوگا اور انشاء اللہ اس کی باقاعدگی قائم رہے گی۔ ''تحقیقی زاویے'' کا ہر شمارہ یونیورسٹی کی ویب سائٹ www.alkhair.edu.pk پر بھی دیکھا جا سکے گا۔

ڈاکٹر عطش دُرّانی (تمغہء امتیاز)
پروفیسر، شعبہ پاکستانی زبانیں و ادب، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

علمیات اور زبانوں میں تحقیق

A Scholar sees the research conducted in the fields of languages , especially in Urdu and Pakistani languages in the light of research philosophy, i.e. Epistemology and Ontology.The definition of knowledge determines the paradigm of research philosophy. As the modern definition of knowledge concludes the knowledge retains with in the papers, books and libraries have only 5 % of the human knowledge. Language and literary research only takes its worth if it is in the research paradigm, i. e. Ontological , Epistemological, and Methodological. There are 3 research paradigms : Positivism, Interpretivism and Critical Theory. Language and literary researches may lie in any of these paradigms. Contemporary research in Urdu and Pakistani languages lack this.

یہ مقالہ اُردو اور پاکستانی زبانوں کی تحقیق میں علمی فلسفہ یا علمیات کے ممکنہ استعمال سے متعلق ہے۔ کوئی علم صرف اس وقت تک قابلِ قبول ہوتا ہے جب تک اس کی بنیاد تحقیقی حقائق پر مبنی نظریے میں گڑی ہوتی ہے۔ نئی تحقیق اس نظریے میں تبدیلی لاتی ہے۔ علم معلومات، حقائق اور مہارتوں کے انسانی تجربے (Experience) کی روشنی میں کسی نظریے یا عملی تفہیم کا نام ہے۔ کتابوں، مقالوں، مضمونوں اور رپورٹوں وغیرہ میں علم کا کل پانچ فی صد حصہ محفوظ ہو پاتا ہے۔ علم کی حدود میں ادراک، مہارتیں، تربیت، عقل سلیم اور تجربات سب کچھ شامل ہوتا ہے، جس سے بامعنی نتائج حاصل ہوسکیں۔ جب بار بار کی تحقیق کے حاصلات ایک سے ہوں تو انھیں حقائق (facts) قرار دیا جاتا ہے۔ انہی حقائق سے علمی پیش گوئی ممکن ہے۔ مجموعۂ حقائق کی اصلیت کو بیان کرنے کے اس نقطۂ نظر کو نظریہ یا تھیوری (Theory) کہا جاتا ہے۔ علم کبھی جامد اور مقید نہیں رہتا۔ یہ عبوری، متحرک اور وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی مسلسل تعمیرِ نو (Reconstruction) ہوتی ہے اور تعمیرِ نو کا یہ فرض تحقیق کے سپرد ہوتا ہے۔ تحقیق اپنے خواص کی بنا پر پہچانی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خواص کسی حد ود (Limits)، حیطۂ کار/ چوحدی/ تحقیقی نقطۂ نظر (Paradigm) یا نظریہ (Theory) کے اندر اور حد بندی یا تحدید (Delimitation) کے پابند ہوں گے۔ اسی بناء پر تحقیق معروضی کہلائے گی۔ کسی بھی فلسفے کو ہم تین حیطۂ کاروں یا چوحدیوں ہی کے دائرے میں دیکھ سکتے ہیں: وجودیات (Ontology)، علمیات (Epistemology) اور طریقیات (Me thodology)۔ اُردو اور پاکستانی زبانوں میں ابھی ممکنہ تحقیق کے حوالے سے ان پہلوؤں پر غور نہیں کیا گیا۔ بیسویں صدی کے

اواخر میں تحقیق کو محض ''علم کی تخلیق بذریعہ تفتیش'' سمجھا گیا تھا اور سائنسی نقطۂ نظر کے حوالے سے اسے محض ایک قواعد کار اور تکنیک گردانا گیا تھا۔ یہ امور اثباتیت (Positivism) کے فلسفے کے تحت وضع ہوتے تھے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں مابعد اثباتیت (Post-positivism) کے فروغ سے دنیا کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ ہماری ادبی تحقیق ابھی اثباتیت کی حدود کو نہیں چھو رہی۔ اس لیے شاید مابعد اثباتیت کی بات کرنا کارے دارد ہے۔ ادبی تحقیق کی چوحدی، حیطۂ کار، دائرۂ عمل یا نقطۂ نظر اسی سے تشکیل پاتا ہے۔ اُردو اور پاکستانی زبانوں میں اُصولِ تحقیق کا جدید مقصود صرف یہی ہے کہ زبان اور ادب کے میدان کی علمی فتوحات میں ایسا اضافہ کیا جائے جو عالمی سطح پر قابل قبول ہو اور تحقیق اصل اور طبع زاد ہو۔ اس تحقیق کے نتائج کو دہرایا جا سکے اور ان سے تحقیقی حقائق برآمد ہوں جو کسی فلسفے اور نظریے یا تھیوری کی تخلیق میں مدد دے سکیں۔ علمی اضافے کا ایک ہی مطلب ہے کہ تحقیق کسی سوال کا شافی جواب مہیا کر سکے۔ مسئلے کے فہم، نئی تکنیک کی تخلیق اور واضح نتائج ہی کسی تحقیق کو مقام اور اہمیت دلا سکتے ہیں۔ زبان اور ادب کے میدان میں تحقیق علمی فلسفہ یا علمیات (Epistemology) کی اسی چوحدی (Paradigm) یا حیطۂ کار میں انجام دی جانی چاہیے۔

اصطلاحات:

جانکاری (Know-how)، وجودیات (Ontology)، علمیات (Epistemology)، طریقیات (Methodology)، اثباتیت (Positivism)، مابعد اثباتیت (Post-positivism)، ادعا (Dogma)، مضمر (Implicit)، واضح (Explicit)، انکشافیہ (Heuristic)، متعلقاتِ علم یا مابعد علم (Meta Knowledge)، حیطۂ کار یا چوحدی (Paradigm)، ثقافتیات (Culturology)

متن:

یہ جاننے کے لیے کہ حقیقت کیا ہے اور اس پر مبنی وجود کا علم کیا ہے، ہمیں یہ جاننا ہوتا ہے کہ خود علم کیا ہے؟ ہم جس چیز کو علم کہہ رہے ہیں کیا وہ محض معلومات اور اعداد وشمار تو نہیں۔ چنانچہ علمیات کا وجودیات (Ontology) کے ساتھ بہت قریبی رشتہ بنتا ہے۔ ایسٹربائی سمتھ (Easterby-Smith) اور اس کے ساتھی کہتے ہیں کہ علمیات دنیا کی حقیقت کے بارے میں جاننے کا سب سے موزوں طریقہ ہے۔ علمیات میں یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ علم کیا ہے اور اس کے ذرائع کیا ہیں۔ بلائکی (Blaiki) کے نزدیک علمیات علم کے طریقوں یا بنیادوں کا نظریہ یا علم ہے جو حقیقت کا ممکنہ علم حاصل کرنے کے مفروضوں پر استوار ہوتا ہے۔ (۷) کائیا (Chia) علمیات کو ''کیا اور کیونکر جاننا ممکن ہے'' اور ''معیارات کا مطالعہ کرنا'' نیز ''یہ جاننا کہ آپ کیسے جان سکتے ہیں'' قرار دیتا ہے۔ ہیچ اور کنلف (Hatch & Cunliffe) کے نزدیک ''علم کیونکر پیدا ہوتا ہے اور وہ کون سی کسوٹی ہے جس پر ہم اچھے علم اور برے علم کو پرکھ سکتے ہیں نیز حقیقت کس طرح ظاہر یا بیان ہو سکتی ہے؟ چنانچہ وجودیات اور علمیات کا باہمی ربط موجود ہے''۔ (۱۰)

جدید تحقیقی طریقے علمی فلسفہ یا علمیات (Epistemology) کی اسی چوحدی (Paradigm) یا حیطۂ کار میں وضع ہوتے

ہیں۔ کوئی علم صرف اس وقت تک قابلِ قبول ہوتا ہے جب تک اس کی بنیاد تحقیقی حقائق پر مبنی نظریے میں پیوستہ ہوتی ہے۔ نئی تحقیق اس نظریے میں تبدیلی لاتی ہے اور یوں علم اپنی عبوری چوحدی پار کرتا رہتا ہے۔

یہ علم فلسفے کی ذیل میں آتا ہے۔ گویا تحقیق سے پہلے تحقیقی فلسفہ جاننا ضروری ہے۔ ہم عام طور پر علم(Knowledge) کو معلومات (Information) کے معنی میں لیتے ہیں اور بعض معلومات رکھنے والے شخص کو عالم قرار دیتے ہیں جو اپنی بات ، بیان یا فکر کو حتمی علم یا ادعا (Dogma) کی صورت میں پیش کرتا ہے، جبکہ علم معلومات، حقائق اور مہارتوں کے انسانی تجربے (Experience) کی روشنی میں کسی نظریے یا عملی تفہیم کا نام ہے۔ یہ مضمر(Implicit) یعنی داخلی مہارت اور واضح (Explicit) یعنی ظاہری ،نظری ہوتا ہے۔ یہ رسمی، منظّم اور عبوری (Tentative) ہوتا ہے۔ علم ہمیشہ وقوفی (Cognitive) طریقِ کار پر منحصر ہوتا ہے۔ جس میں ادراک، تعلّم، ابلاغ، استدلال اور انسانیت کو مجموعی طور پر تسلیم کرنا شامل ہیں۔ (۵)

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں ہمارے ہاں ایک روایت غیر ضروری طور پر چلی آ رہی ہے۔ وہ یہ کہ علم کتابوں، مقالوں، مضمونوں اور رپورٹوں وغیرہ میں ہوتا ہے۔ اس لیے تدریسی عمل میں ان دستاویزات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ جبکہ ان سب میں علم کا کل پانچ فی صد حصہ محفوظ ہو پاتا ہے۔ گویا دنیا بھر کے کتب خانے کل علم کے صرف پانچ فی صد کے امین ہیں۔ باقی ؟۔

ہم علم کو ''تجربے (Experience) یا مطالعے سے حاصل کردہ فہم'' قرار دیتے ہیں۔ یہ صرف جانکاری (Know-how) ہے۔ یہ حقائق (Facts)، قواعدِ طریق کار(Procedural Rules) یا انکشافیہ (Heuristic) کا مجموعہ ہو سکتا ہے۔ حقائق کسی موضوع کے بارے میں صداقت کے چند عناصر کا بیان ہوتے ہیں۔ جیسے ''سورج مشرق سے نکلتا ہے''۔ قواعد طریق کار اصل کے ساتھ نسبت/تعلق کے سلسلوں کو بیان کرتے ہیں جیسے ''شاہراہ میں داخل ہونے سے پہلے ٹریفک کا جائزہ لے لیں''۔ انکشافیہ ایک عمومی قاعدہ یا وجدانی بصیرت(Insight) کا قاعدہ ہوتا ہے جو تجربوں کا نچوڑ کہلاتا ہے۔ جیسے ''حد رفتار سے محض پانچ میل زیادہ کی رفتار پر چالان نہیں ہو سکتا''۔ (۵،۱۳)

علم سے پہلے معلومات (Information) اور کوائف(Data) موجود ہوتے ہیں۔ انھیں سمجھنے کے بعد ہی ہم علم کی تفہیم کر سکتے ہیں۔ کوائف غیر منظّم اور غیر مرتب اعداد و شمار اور حقائق کا نام ہے۔ یہ جامد ہوتے ہیں۔ معلومات (Information) ان کوائف کو صورت، سمت اور حرکت دینے کا نام ہے تا کہ ان سے معنی برآمد ہوں اور بعد میں ان سے کوئی فیصلہ (Judgement) کیا جا سکے۔ علم (Knowledge) معلومات، تجربات ، ذہانت کی سمت اور مقدار کا ایک پیچیدہ مجرد مرکب ہے، اسے جاننا کوائف اور معلومات کی نسبت بہت مشکل ہے۔ ٹوانہ کے نزدیک، آپ اسے حرکت پذیر معلومات کہہ سکتے ہیں، جو صحیح صورت میں صحیح وقت پر اور صحیح مقام پر فیصلہ کرنے کے کام آتا ہے۔ سائنٹیفک انداز میں ہم علم کو کسی خاص میدان میں انسانی فہم قرار دے سکتے ہیں جو مطالعے اور تجربات کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے''۔ (۵)

علم کی اصطلاح کئی معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ سادہ انداز میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ ''سیکھنے، سوچنے اور کسی شعبے میں موجود

مسائل کو سمجھنے'' کا نام ہے۔ڈیونپورٹ (Devenport)اور پروسیک(Prosak)کے نزدیک علم ''محیط تجربات (Framed Experiences)، اقدار، سیاقی معلومات اور ماہرانہ وجدانی بصیرت (Insight) کے مائع آمیزے(Fluid Mixture) کا نام ہے جو نئے تجربات اور معلومات کے جائزے اور شمولیت کے لیے ایک لائحہ عمل مہیا کرتا ہے''(۵)۔علم محض معلومات تک محدود نہیں ہوتا اور معلومات محض کوائف کا نام نہیں۔علم کی وسعت معلومات کی مقدار پر اور معلومات کی حدود کوائف کی وسعت پر ہے۔علم کی حدود میں ادراک، مہارتیں، تربیت، عقل سلیم اور تجربات سب کچھ شامل ہوتا ہے، جس سے بامعنی نتائج حاصل ہوسکیں۔علم حقیقت کے ساتھ انسانی تعامل،سماجی فطرت، صداقت کے یقین کے ساتھ سابقہ موجود علم پر مبنی ہوتا ہے۔علم کی اگلی منزل دانش (Wisdom) ہے۔

علم صداقت کی کھوج لگاتا ہے اور عبوری طور پر حقیقت بیان کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ صداقت کی کھوج اور جانچ تحقیق کے ذریعے ہی سے ممکن ہے اور جب بار بار کی تحقیق کے حاصلات ایک سے ہوں تو انھیں حقائق (facts) قرار دیا جاتا ہے۔ انھی حقائق سے علمی پیش گوئی ممکن ہے۔ مجموعۂ حقائق کی اصلیت کو بیان کرنے کے اس نقطۂ نظر کو نظریہ یا تھیوری (Theory) کہا جاتا ہے۔علم کی ماہیئت کو سمجھنا، اس کے لیے معلومات کی جمع آوری، بندوبست اور اس کی ترتیب و تنظیم کو ایک اور اصطلاح متعلقاتِ علم یا مابعد علم(Meta Knowledge) سے یاد کیا جاتا ہے۔(۵،۱۳)

تحقیق کو اوّل متعلقاتِ علم ہی سے واسطہ پڑتا ہے۔حصولِ علم کے طریقے، اصول تحقیق، تدریسیات، کورس وغیرہ مابعدیا متعلقاتِ علم قرار پاتے ہیں۔تحقیقی فلسفہ بھی اسی مابعدِ علم ہی میں شامل ہے۔ چنانچہ تحقیق کے تمام طریقے جاننا اسی کے ذیل میں آتا ہے۔ جدید تحقیقی طریقے علمی فلسفہ یا علمیات (Epistemology) کی اسی چوحدی(Paradigm)یا حیطۂ کار میں وضع ہوتے ہیں۔ کوئی علم صرف اس وقت تک قابلِ قبول ہوتا ہے جب تک اس کی بنیاد تحقیقی حقائق پر مبنی نظریے میں گڑی ہوتی ہے۔نئی تحقیق اس نظریے میں تبدیلی لاتی ہے اور یوں علم اپنی عبوری چوحدی پار کرتا رہتا ہے۔علم کبھی جامد اور مقید نہیں رہتا۔ یہ عبوری، متحرک اور وسیع تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی مسلسل تعمیرِ نو (Reconstruction) ہوتی ہے اور تعمیرِ نو کا یہ فرض تحقیق کے سپرد ہوتا ہے۔تحقیق اپنے خواص کی بنا پر پہچانی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خواص کسی حد ود (Limits)، حیطۂ کار/ چوحدی/تحقیقی نقطۂ نظر(Paradigm) یا نظریہ (Theory) کے اندر اور حد بندی یا تحدید (Delimitation) کے پابند ہوں گے۔اسی بناء پر تحقیق معروضی کہلائے گی۔(۹،۱۲)

جدید تحقیق کے اُصولوں پر ابھی مباحث جاری ہیں۔اُصولاً ادبی تحقیق گزرگاہ میں ہے۔ایسے میں تحقیقی حیطۂ کار یا چوحدی (Paradigm) کے حوالے سے تحقیقی فلسفے اور نظریے یا تھیوری پر بات کرنا اُردو اور پاکستانی زبانوں میں ہمارے ہاں زبان اور ادب کے میدان میں بہت ہی قبل از وقت ہے لیکن اہل فکرونظر کے لیے شاید یہ ایک تحریک اور تشویق کا باعث بنے۔تحقیق سے پہلے تحقیقی فلسفہ جاننا ضروری ہے۔ہر **تحقیق بنیادی طور پر کسی فلسفے ،نظریے یا تھیوری کی روشنی ہی میں انجام دی جاتی ہے**۔ہر تحقیق اسی فلسفے کی چوحدی یا حیطۂ کار کے اندر کام کرتی ہے۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں اُصولِ تحقیق کا جدید مقصود صرف یہی ہے کہ زبان اورادب کے میدان کی علمی فتوحات میں ایسا اضافہ کیا جائے جو عالمی سطح پر قابل قبول ہو اور تحقیق اصل اور طبع زاد ہو۔ اس تحقیق کے نتائج کو دہرایا جاسکے اوران سے تحقیقی حقائق بر آمد ہوں جو کسی فلسفے اور نظریے یا تھیوری کی تخلیق میں مدد دے سکیں۔علمی اضافے کا ایک ہی مطلب ہے کہ تحقیق کسی سوال کا شافی جواب مہیا کر سکے۔مسئلے کے فہم ،نئی تکنیک کی تخلیق اور واضح نتائج ہی کسی تحقیق کو مقام اوراہمیت دلا سکتے ہیں۔تحقیق اس قابل ہو کہ :

۱۔ دوسروں کو قائل کر سکے

۲۔ تحقیقی مہارت کا اظہار کر سکے

۳۔ تحقیق کار کی اہلیت ثابت کر سکے

۴۔ تحقیقی منصوبہ بندی پیش کر سکے

تحقیقی فلسفے سے قبل ہمیں تحقیقی حیطۂ کار یا تحقیقی چوحدی کو سمجھنا ہوگا۔گوبا اور لنکن (Guba & Lincoln) اسے عقائد کا سیٹ اور بنیادی اُصول قرار دیتے ہیں۔تاہم ان کے نزدیک حیطۂ کار یا چوحدی ہی سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق کا درون وبیرون کیا ہے۔انھوں نے اسے تین بنیادی فلسفیانہ سوالات تک محدود کیا ہے۔(۸)

کسی بھی فلسفے کو ہم انھی تین حیطۂ کاروں یا چوحدیوں ہی کے دائرے میں دیکھ سکتے ہیں: وجودیات (Ontology)، علمیات(Epistemology) اور طریقیات(Methodology۔ اُردو میں ابھی ممکنہ تحقیق کے حوالے سے ان پہلوؤں پر غور نہیں کیا گیا۔تحقیقی حیطۂ کار یا چوحدی کے موضوع پر بات ایک آدھ مقالے سے آگے نہیں بڑھتی ۔

لسانی و ادبی تحقیق میں انسانی حوالہ بنیادی حیثیت رکھتا ہے اس لیے بقول بلائکی کی آزاد مرضی اس تحقیق میں پیچیدگی پیدا کر دیتی ہے اور یوں کسی تحقیقی فلسفے کی بنیاد درکار ہوتی ہے۔ پال فلاورز نے بلائکی ، کوویل اورلنکن وغیرہ کے حوالے سے اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ (۷) اُردو اور پاکستانی زبانوں میں بھی یہی تینوں فلسفے تحقیقی حیطۂ کاروں یا چوحدیوں کی صورت پیدا کرتے ہیں۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں کے تحقیقی کاموں میں کمزوری کے ضمن میں ایک رویّہ ''رواروی'' اور ''چلت'' کاموں کے انداز کا ہے۔ اس کے لیے عام دلیل یہ دی جاتی رہی ہے کہ دوسرے مضامین کے ساتھ مقابلہ کرنے کے لیے زبانوں میں زیادہ سے زیادہ ڈاکٹر پیدا کیے جائیں۔ حالانکہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اُردو اور پاکستانی زبانوں میں زیادہ سے زیادہ کڑے معیار پر مبنی مقالات وجود میں لائے جائیں۔ اسی سے دوسرے مضامین کے مقابلے میں زبانوں میں تحقیق بہتر ہوسکتی ہے۔ معیار کے حصول کا یہی طریقہ ہے کہ زبانوں کی ادبی تحقیق کو سائنٹیفک اُصولوں پر اُستوار کیا جائے اور ادبی تحقیق میں بھی دنیا کے ساتھ ہم قدم ہوا جائے۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں تحقیق کے نام پر کئی کام غیر ضروری طور پر بھی انجام دیے گئے ہیں اور کئی اہم کام ادھورے رہ گئے ہیں۔ جہاں تک تحقیقی اثرات کا تعلق ہے، ان میں سے بہت سے کام شاید ہی ایسی کوئی ضرورت پُوری کرتے ہوں۔ بیشتر کام

ذاتی رسائی یا خواہشوں پر انجام پائے، اُردو اور پاکستانی زبانوں کے مؤرخ کو بھی ان کی کم ہی ضرورت پڑے گی۔ مستقبل میں ایسے کام صرف حقیقی ضرورت پر مبنی انجام دیے جائیں تو تدوین و تحقیق کا فرض صحیح معنوں میں ادا ہوگا۔

اُردو اور پاکستانی زبانوں میں اب تک تحقیق کا مقصود صرف متون کی صحت رہا ہے جو ادبی تحقیق کا منصب ادا نہیں کر پاتا کیونکہ متن محض تحریری پہلو نہیں رکھتا جس کے لیے تحقیق کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ متن ایک پیچیدہ نفسیاتی اور سماجی یا عمرانی عمل ہے جس پر معنویات (Semantics) اور ثقافتیات (Culturology) کے حوالے سے تحقیق درکار ہوتی ہے، اس لیے یہ متنی تاریخ کا کام کوئی خاص تحقیقی کارنامہ قرار نہیں پاتا۔ متنی لسانیات البتہ ایک تحقیقی میدان ہے۔

بیسویں صدی کے اواخر میں تحقیق کو محض ''علم کی تخلیق بذریعہ تفتیش'' سمجھا گیا تھا اور سائنسی نقطۂ نظر کے حوالے سے اسے محض ایک قواعد کار اور تکنیک گردانا گیا تھا۔ یہ امور اثباتیت (Positivism) کے فلسفے کے تحت وضع ہوتے تھے۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں مابعد اثباتیت (Post-positivism) کے فروغ سے دنیا کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ ہماری ادبی تحقیق ابھی اثباتیت کی حدود کو نہیں چھو پا رہی۔ اس لیے شاید مابعد اثباتیت کی بات کرنا کارے دارد ہے۔ ادبی تحقیق کی چوحدی، حیطۂ کار، دائرۂ عمل یا نقطۂ نظر اسی سے تشکیل پاتا ہے۔

علمیات کو جاننے کے لیے ہمیں وجودیات کو سمجھنا پڑتا ہے کہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ بلانکی نے وجودیات کی اساسی تعریف یوں کی ہے:

> ''وجود کے مطالعے کا علم، اس کی روشنی میں سماجی علوم، وجود، اس کی ماہیئت، اس کے عناصر ترکیبی اور ان عناصر کے باہمی ربط کو جانچتے ہیں''۔ (۷)

مختصر یہ کہ وجودیات حقیقت کی فطرت کے بارے میں ہمارے نقطۂ نظر کو بیان کرتی ہے اور یہ کہ کیا حقیقت معروضی طور پر موجود ہے یا محض موضوعی طور پر ہمارے ذہنوں میں ہے؟ ہیچ اور کنلفاس نقطہ نظر کو واضح کرنے کے لیے دونوں کو روزمرہ مثال اور ایک سماجی علوم کی مثال کے طور پر لیتے ہیں۔ یعنی جو کچھ حقیقت میں ہو رہا ہے اور جو محض مصنف کے خیال میں ہو رہا ہے۔ اس کی ایک مثال ناول ***راجا گدھ*** سے دی جا سکتی ہے کہ جس نفسیاتی کیفیت کے گرد بانو قدسیہ نے سیمی کے کردار کا تانا بانا بُنا ہے، کیا وہ حقیقت میں ایسی ہو سکتی ہے یا محض مصنف کے ذہن کی کارستانی ہے؟ چنانچہ ثقافت اور فریبِ نظر، تخیل کی اڑان، نیز حقیقت کے بارے میں انفرادی اور اجتماعی فکر اور یہ کہ کیا حقیقت محض نفسیاتی واردات (Experience) کی بنیاد پر سامنے آتی ہے یا ماورائے حیات کوئی چیز ہے؟ ہم سب اپنی تحریروں میں وجودیاتی مفروضوں کا سہارا لیتے ہیں جس سے ہم ادب کے ذریعے حقیقت کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یوں ادب برائے زندگی کی ترجمانی کرنے لگتے ہیں۔ تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ہمیں ادیبوں کے ان زیرکار مفروضوں کو بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ کس علمیاتی اور وجودیاتی فلسفے کا سہارا لے رہے ہیں۔

ادبی تحقیق کار وجودیات کے جس پہلو کو اختیار کرتا ہے لا محالہ اسے علمیات کا بھی اسی سے مربوط مفروضہ زیرکار رکھنا پڑتا ہے۔ ایک معروضی علمیات کا ذکر ایرک سن اور کووالینن (Erakson & Kovalainen) کرتے ہیں کہ وہ خارجی طور پر ایک

اپنا وجود رکھتی ہے جبکہ موضوعی علمیات میں ہمارے اپنے مشاہدوں، تجربوں اور تشریحوں کے علاوہ ہم کسی حقیقت کو نہیں جان سکتے۔ ساندر (Sander) اور اس کے ساتھیوں نے اس کی مزید وضاحت کی ہے کہ'' ایسے میں تحقیق کار کو اشیاء سے حاصل شدہ اپنے کوائف کو جو خارجی حقیقت کے طور پر موجود ہوتے ہیں، صرف اعداد و شمار ہی کے انداز میں نہ کہ عبارت آرائی کے طور پر بیان کرنا چاہیے اور نہ ہی کوئی فیصلہ کن بیان دینا چاہیے''۔ (۷)

اُردو اور پاکستانی زبانوں کی ادبی تحقیق میں موضوعیت کی اس قدر بھرمار ہوتی ہے کہ حقیقی نتائج بیان کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے چنانچہ ہمیں ادبی تحقیق کی چوحدی کا تعین کرنا پڑے گا۔ اسی کو ہم اپنا تحقیقی فلسفہ قرار دیں گے۔ اسی سے ہمارا تحقیقی طریقہ برآمد ہوگا۔

اُصولِ تحقیق کی بنیاد تحقیق کی چوحدی، نقطۂ نظر یا حیطۂ کار سے حاصل ہوتی ہے۔ Paradigm کا لفظ یونانی زبان سے آیا ہے، جس کا مطلب ہے''ہر سمت کے ساتھ ساتھ''۔ گویا یہ کسی شکلی نمونے کا احاطہ ہوتی ہے۔ اسے کُل اندازِ فکر یا اصولی نقطۂ نظر بھی کہا جاتا ہے۔ **چاروں حدود کے ملنے سے کسی چوکھٹے کی جو تصویر بنتی ہے، اسے اس کی چوحدی یا حیطۂ کار کہا جاتا ہے۔ فکری طور پر چوحدی بنیادی اعتقادات پر مبنی ہوتی ہے۔** کائنات کی نوعیت، فرد کا مقام اور ان کے باہمی تعلقات کی امکانی حدود، یہ سب کچھ چوحدی کہلاتے ہیں۔ تحقیق بھی کسی نہ کسی چوحدی یا حیطۂ کار کے اندر ہوتی ہے۔ یہ اس سے باہر نہیں جا سکتی۔ حتیٰ کہ اس کے حقائق اور نظریات بھی۔ (۱۲،۷)

ہینگ (Henning) کے نزدیک حیطۂ کار یا چوحدی نظریے (Theory) پر منحصر ہوتی ہے۔ یعنی ایسا چوکھٹا صرف جس کے اندر ہی وہ نظریہ وجود پا سکتا ہے۔ گویا تحقیقی نظریہ جن حدود میں کارفرما ہوگا، اس کا ذاتی رویوں اور کرداروں پر جو اثر رونما ہوگا، پیشہ ورانہ عمل کی جو صورت پیدا ہو گی اور تحقیق کے عمل کے ساتھ جو انداز وقوع پذیر ہو گا، وہ اس کی تحقیقی حیطۂ کار یا چوحدی یا Research Paradigm کہلائے گا۔ (۱۲،۷)

گوبا اور لنکن (Guba & Lincoln) نے **تین بنیادی سوالات** کو کسی تحقیقی چوحدی یا حیطۂ کار کی اساس قرار دیا ہے (۸):

۱۔ **وجودیاتی (Ontological) سوال:**

یعنی حقیقت کی ہیئت اور فطرت یا نوعیت کیا ہے؟ جسے ہم جاننا چاہتے ہیں۔

۲۔ **علمیاتی (Epistemological) سوال:**

علم کے لیے بنیادی عقیدہ کیا ہے؟ یعنی کیا کچھ معلوم ہو سکتا ہے؟

۳۔ **طریقیاتی (Methodological) سوال:**

تحقیق کار اپنے علمی عقیدے میں کہاں تک جا سکتا یا کس حد تک تحقیق کر سکتا ہے؟

تحقیق کی تین چوحدیاں یا حیطۂ کار

الف۔ اثباتیت (Positivism)

ب۔ ترجمانیت (Interpretism)

ج۔ تنقیدی نظریہ (Critical Theory)

علمیاتی سوالات

الف۔ اثباتیت(Positivism) کی چوحدی یا حیطۂ کار

تجزیۂ چوحدی(Paradigm Analysis) کے لیے سوالات:

۱۔ علم کی فطرت/نوعیت

O علم کو منظّم انداز میں بیان کیا جا سکتا ہے۔

O علم توثیق کردہ فرضیوں پر مشتمل ہوتا ہے، جنھیں حقائق یا قوانین کہتے ہیں۔

O امکانیت۔ زیادہ افراد یا گروہوں کے لیے صداقت رکھتا ہے یا کئی صورتوں میں وقوع پذیر ہوتا ہے۔

O علم درست اور یقینی ہوتا ہے۔

۲۔ تحقیقی حاصلات صحیح ہیں اگر

O قابل مشاہدہ و پیمایش ہوں۔

O دہرائے جانے اور تعمیم کے قابل ہوں۔

۳۔ عقلِ سلیم کا کردار

O نہیں ہے.....صرف استخراجی استدلال(Inductive Reasoning)

ب۔ ترجمانیت(Interpretivism) کی چوحدی یا حیطۂ کار

تجزیۂ چوحدی(Paradigm Analysis) یا حیطۂ کار کے لیے سوالات:

۱۔ علم کی فطرت/نوعیت

O علم نہ صرف قابل مشاہدہ مظاہر پر مبنی ہوتا ہے بلکہ موضوعی عقائد، اقدار، دلائل اور فہم پر منحصر ہوتا ہے۔

O علم ایک ساخت (Structure) رکھتا ہے۔

O علم اس انداز کے متعلق ہوتا ہے، جس میں لوگ اپنی زندگیوں کو معنی پہناتے ہیں۔

۲۔ تحقیقی حاصلات صحیح ہیں اگر

O تحقیقی کمیونٹی کا ایک عمل ہوں، جس کی اطلاع شرکا دیں اور دوسرے اس کا جائزہ لیں اور تصدیق کریں۔

۳۔ عقلِ سلیم کا کردار

O عقلِ سلیم عام لوگوں کے روزمرہ نظریات کی طاقت ظاہر کرتی ہے۔

تعاملی اور استخراجی استدلال استعمال ہوتا ہے۔

ج۔ تنقیدی نظریہ (Critical Theory) کی چوحدی یا حیطۂ کار

تجزیۂ چوحدی (Paradigm Analysis) کے لیے سوالات:

۱۔ علم کی فطرت/نوعیت

- O علم منتشر اور منقسم ہے۔
- O علم طاقت کا سرچشمہ ہے۔
- O علم زندہ تجربے اور سماجی تعلق سے تشکیل پاتا ہے۔
- O واقعات سماجی اور معاشی تناظر میں سمجھے جا سکتے ہیں۔

۲۔ تحقیقی حاصلات صحیح ہیں اگر

- O مخصوص سیاق و سباق میں مسائل حل کر سکے۔
- O حل دیگر سیاق و سباق میں بھی قابل اطلاق ہو سکتے ہیں مگر بطور فرضیہ جانچے جائیں۔
- O اوہام سے پردہ اٹھا سکیں۔

۳۔ عقل سلیم کا کردار

- O غلط عقائد جو طاقت اور معروضی شرائط کو چھاپتے ہیں۔

ماخذ / حوالہ جات (Sources)

۱۔ جویش، فاروق، ڈاکٹر، **تعلیمی تحقیق اور میدانی مطالعات**، جہانِ تحقیق پبلی کیشنز، کراچی

۲۔ عطش درانی، ڈاکٹر، **اُصولِ ادبی تحقیق**، نذیر سنز، لاہور، 2012ء

۳۔ عطش درانی، ڈاکٹر، **لسانی و ادبی تحقیق**، نذیر سنز، لاہور، 2013ء

۴۔ **مطالعاتی رہنما۔ اطلاقی تحقیق**، پی ایچ ڈی کورس، شعبہ اُردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد، 2012ء

۵. Awad, Elias M. & Hassan M. Ghaziri, **Knowledge Management,** Dorling Kindersley, New Delhi, 7th Impression, 2011.

۶. Davenport, Thomas H. & Prusak Lawrence, **Working Knowledge**, Harvard Business School Press, Boston MA, 2000.

۷. Flower, Paul, **Research Philosophies- Importance and Relevance**, Issue, 1, Jan. 2009, [Blaiki, N.(1993), **Approaches to Social Enquiry**, 1st ed., Polity Press,

Cambridg and Kvale, S., (1996), *InterView*, 1st ed., Sage Publications, Ltd., London.]

۸. Guba, E. G., and Lincoln, Y. S., **Competing Paradigms in Qualitative Research,** Ch.6, in Hair, J. F. J., Anderson, R. E., Tatham, R. L., & Black,W. C. , **Multivariate Data Analysis,** (4th ed.), Prentice Hall, Saddle River, NJ, 1995.

۹. Harners, James L., **Literary Research Guide**, Modern Language Association, New York, 56. Hatch, M. J. and Cunliffe, A. L., **Organization Theory** , 2nd ed., OUP, Oxford, 2006.

۱۰. Hatcher, L., **A Step-by-Step Approach to Using the SAS® System for Factor Analysis and Structural Equation Modeling**, SAS Institute, Inc., Cary, NC, 1994.

۱۱. Sorenson, Sharon., **The Research Paper: A Contemporary Approach,**AMSCO, New York, 1994.

۱۲. Tiwana, Amrit, **The Knowledge Management Toolkit**, Upper Saddle River, NJ: Prentice Hall, 2000.

(اس مقالے میں حوالے دینے کا مروج طریقہ اختیار نہیں کیا گیا۔ مقالہ نگار نے جو طریقہ اختیار کیا ہے اسے برقرار رکھا گیا ہے)۔

ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر
صدر شعبہ اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

دبستانِ سیال شریف کا ملفوظاتی ادب: ایک تعارفی مطالعہ

This article deals with the oral tales of Chistia order of Sial sharif school of thought. Hazrat Khawja Shams ud Din Sialvi is the pioneer of *Khanqah* in Sial sharif. Thousands of people embraced *Bei 'at* at his exalted hands. His sayings were recorded by his spiritual disciple Sayyed Mummad Saeed Zanjani in *Mirat ul Aarfeen*. In the present article, the researcher introduces and analyses the *Malfuzati Adab* (holy sayings), which were written in Sial Sharif and its successive *Khangahs*. In first two decades of the Twentith century this sacred literature was written in Persian language but with the passage of time, the sayings of sufis were started to be written in Urdu. Those collections of sayings , which were written in Persian originally, were translated into Urdu as well. In the present study, the researcher, discusses all the versions of *Malfuzati* literature.

سیال شریف کی بارگاہ خواجہ پیر پٹھان محمد سلیمان خان تونسوی [م ۱۲۶۷ھ] کے خلیفۂ اجل خواجہ شمس الدین سیالوی [م ۱۳۰۰ھ] کے انوار و تجلیات سے ضیا بار ہے۔ ان کی وساطت سے یہ خطۂ خوش آثار پہلی بار سلسلۂ چشتیہ کے ہمہ رنگ اور ہمہ گیر: زندگی کے احساسِ جمال سے پیالہ گیر ہوا۔ بانیِ خانقاہ کی حیثیت سے وہ زیبِ سجادہ ہوئے، تو ان کی عرفانی اور روحانی خوشبو نے دوردراز بسنے والوں کو بھی اپنی گرفت میں لے لیا۔ لاکھوں لوگ ان کے سایۂ عاطفت میں پناہ گزیں ہوئے اور ان کے دلوں کی دنیا بدل گئی۔ ایک ایسا خاموش انقلاب آیا کہ جس نے ہر ایک شکستہ دل کے مشام جاں کو معطر کر دیا۔ کتنی ہی چشتیہ خانقاہیں (اسلامی مدرسے) ان کے خلفا کی بدولت معرضِ اظہار میں آئیں اور ان میں روحانیت کی تعلیم عام ہوئی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی رقمطراز ہیں کہ:

> ''شیخ شمس الدین نے سیال شریف میں اپنا خانقاہی نظام اعلیٰ پیمانے پر قائم کیا تھا۔ ان کے یہاں لنگر کا خاص اہتمام تھا۔ تمام زائرین اور مسافروں کو کھانا لنگر خانے سے ملتا تھا۔ شہر کے مفلسوں اور مسکینوں کو بھی کھانا دیا جاتا تھا۔ قیام کا انتظام بہت اچھا تھا۔ چارپائی اور بستر ہر آنے والے کے لیے مہیا کیے جاتے تھے۔ جو لوگ مستقلاً خانقاہ میں رہتے تھے، ان کو کپڑا بھی دیا جاتا تھا۔ شیخ سیالوی کا اخلاق بہت اعلیٰ تھا۔ اجنبی اور ملاقاتی سے ایک طرح ملتے تھے۔ ہر آنے والے سے خلوص اور محبت کا اظہار کرتے تھے۔ ہمدردی سے ہر ایک کے دکھ درد کی داستان سنتے تھے اور مناسبِ حال علاج کرتے تھے۔ شریعت کے معاملے میں بہت سخت گیر تھے اور اس سلسلے میں مریدین پر سختی کو ضروری سمجھتے تھے''۔(۱)

خواجۂ سیال غریب نواز نے چشتیہ سلسلے کی تعلیمات کو ہر خاص و عام کے دل کی دھڑکن بنا دیا۔انھوں نے فکر و خیال کی ایسی شمع روشن کی،جس کی بدولت درماندہ راہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہوگئے۔مشائخِ چشت کی روایت پر عمل پیرا ہو کر وہ اپنی خوش کلامی کے رنگ اور خوشبو دان کرتے رہے اور یوں ان کے سامعین اپنے ظرف اور استعداد کے مطابق احساس اور شعور کے پیمانے لبریز کرتے رہے اور ملفوظات نگاری کی روایت نئے موسموں کا سندیسہ بن کر چشتیہ نظامِ فکر و خیال کے افق پر طلوع ہوتی رہی۔خواجہ سیالوی کے بعد ان کے خلفا بھی اسی روایت کے امین رہے اوران کی محفلیں بھی اسی رنگ اور آہنگ کا منظر تخلیق کرتی رہیں،جو ان کے پیر و مرشد کی بارگاہ تقدس مآب کا خاصہ تھیں۔ان پُر کیف اور پُر انوار مجالس میں رنگوں اورخوشبوؤں کا جو رقص جاری رہا، ملفوظاتی ادب کی کتابوں میں ان کی عکس اندازی اوراحساسِ جمال کی جمع آوری کے مناظر تخلیق ہوتے گئے اور یوں ایسا سرمایۂ فکر اور متاعِ خیال سامنے آیا،جس کی نظیر نہیں ملتی۔اس مقالے میں سیال شریف اور اس کے فیضِ نسبت سے آباد خانقاہوں میں تخلیق ہونے والے ملفوظاتی ادب کا ایک تعارفی جائزہ مرتب کیا گیا ہے،تاکہ ان مجالس کے صدر نشینوں کی گل افشانی کے کچھ مظاہر اور مناظر پیش کیے جاسکیں۔

سیال شریف کا ملفوظاتی ادب:

[۱]

مرأۃ العاشقین (۲) خواجہ شمس الدین سیالوی کے ملفوظاتِ عالیہ کا مجموعہ ہے۔اس کے مرتب خواجہ سیالوی کے دامن گرفتہ اور فیض یافتہ سید محمد سعید زنجانی ہیں۔وہ مدتوں اپنے شیخ کے کنارِ شفقت میں پناہ گزیں رہے۔انھوں نے ان پُر ضیا اور مشکبار لمحوں کو عکس انداز کرنے اور ان کی مہکار سے وجودِ جاں کو ہمکنار کرنے کا جتن کیا،تو ان کی اس کاوش کا حاصل **مرأۃ العاشقین** کی صورت میں جلوہ افروز ہوا۔وہ ۱۵۔ربیع الاول ۱۲۸۷ھ کو شرفِ غلامی سے فیض یاب ہوئے اور ایک ماہ بعد انھوں نے ملفوظ نگاری کا آغاز کیا اور اپنے پیر و مرشد کی پُر انوار مجالس کی عکس گری میں اپنے سوزِ دروں کی تابنا کی اور حسنِ طبیعت کی خوش آہنگی کا بین ثبوت دیا۔انھوں نے چالیس موضوعات کے زیرِ عنوان مجالس کی کیفیاتی بوقلمونی کو وحدتِ احساس کی تعبیر عطا کی،جس سے ان مجالس کا معنوی منظر نامہ خواجہ سیالوی غریب نواز کی بصیرت افروز جمالیات کا ترجمان ہوا۔ان میں صداقتِ احساس کے رنگ بھی نمایاں ہوئے اور ان کی تجلیاتی جمالیات کی تہذیب بھی منکشف ہوئی۔

مرآۃ العاشقین ایک بار ۱۳۰۲ھ (۳) میں اشاعت آشنا ہوئی۔اس کی طباعت کی سعادت مصطفائی پریس،لاہور کے کار پردازوں کے حصے میں آئی ، جنھوں نے خواجہ سیالوی کی خوش کلامی کے مناظر کی بصیرت اور بصارت افروزی کے مظاہر کو پھیلانے کا اہتمام کیا۔ایک سو بتیس برسوں کا سفر طے کرتی یہ کتاب اب خال خال عقیدت گزاروں کے پاس بطورِ تبرک محفوظ ہے۔اس کے اصل متن کی تدوین ڈاکٹر معین نظامی [استاد شعبۂ فارسی ،پنجاب یونی ورسٹی، لاہور] کے زیرِ نظر ہے۔ان شاء اللہ یہ متن جدید تحقیقی اور تدوینی اصولوں کی روشنی میں مرتب ہو کر بارگاہِ خواجہ سیالوی کے انوار کی انعکاس پذیری میں جلوہ گر ہو گا۔

اس ملفوظاتی مجموعے کا اردو ترجمہ **پُر گوہر** کے عنوان سے پروفیسر غلام نظام الدین نے کیا،جو ۱۹۹۸ء / ۱۴۱۹ھ میں تصوف

فاؤنڈیشن، لاہور کے اہتمام سے طبع اور اردو دان طبقے میں مقبولِ عام ہوا۔ یہ ترجمہ صاحبِ ملفوظ کے اقوال و ارشادات کی خوشبو سے معطر ہے۔ یہ ترجمہ اس قدر متن کے معنوی اور فکری مدار سے ہم آہنگ ہے کہ ان کے مابین فاصلہ بالکل نہیں ہے۔ مترجم نے لکھا ہے کہ:

''**مرآۃ العاشقین** میں کہیں کہیں ابہام بھی تھا، لیکن ایسے موقعوں پر مترجم نے اس لیے اپنی طرف سے کوئی صراحت نہیں کی، تاکہ ملفوظات کی اصل نوعیت جوں کی توں برقرار رہے''۔(۴)

ترجمہ نگار اس متصوفانہ صداقتِ احساس سے مالا مال تھے، جو ایسی کتابوں کی ترتیب و تہذیب اور ان کے تراجم کے لیے لازمی امر ہے۔ انھوں نے فارسی کی تہذیبی معنویت کو اردو کے لباس سے مزین کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

انوارِ قمریہ (۵) شیخ الاسلام محمد قمر الدین سیالوی (م ۲۰ ۔ جولائی ۱۹۸۱ء) کے ملفوظاتِ عالیہ کا مجموعہ ہے ۔ اس کے مرتب اور جامع قاری غلام احمد ہیں۔ انھوں نے تین جلدوں میں اپنے شیخ کے ملفوظات کی ترقیم کی۔ یہ مجموعہ دارالعلوم قمر الاسلام سلیمانیہ، کراچی کے زیرِ اہتمام اشاعت پذیر ہوا۔ تینوں جلدوں کی اشاعتی تفصیل حسبِ ذیل ہے:

جلد اول: بارِ اول اپریل ۲۰۰۲ء: صفحات ۳۷۲

جلد دوم: بارِ اول مارچ ۲۰۰۳ء: صفحات ۳۰۴

جلد سوم: بارِ اول اپریل ۲۰۰۴ء: صفحات ۳۵۹

یہ مجموعہ کیا ہے؟ گنجینۂ معنی کا طلسم کدہ ہے۔ اس کے ایک ایک جملے میں جہانِ معنی کی کئی دنیائیں آباد ہیں۔ شیخ الاسلام ایک ہمہ جہت اور ہمہ رنگ شخصیت تھے۔ ان کے ان ملفوظات میں ان کی زندگی کے کتنے ہی فکری اور معنوی رنگ عکس انداز ہوئے ہیں، جن سے حسنِ خیال کی تعبیر: جمالیاتی احساس کی سچائی سے معطر ہے۔ فکر و خیال کی اتنی بصیرت افروز تفہیم اور تعبیر ان کی خوش کلامی کا ایسا ماحول مرتب کرتی ہیں کہ عرفان کے رنگ بکھر کے قارئین کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں ۔ یوں ان کی گفتگوئے دل نشین کا پیرایۂ اظہار ایک ایسے اسلوب کے پیکر میں ڈھل جاتا ہے کہ جس کی تابنا کی اور رعنائی کا دائرۂ اثر پھیلتا جاتا ہے ۔

شریعت وطریقت کے نیرِ تاباں (۶) شیخ الاسلام حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی کے اقوال اور ارشادات کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے مرتب عربی زبان و ادب کے استاد ڈاکٹر خالق داد ملک ہیں۔ ملفوظاتی ادب کی روایت میں یہ مجموعہ اس حوالے سے منفرد اور ممتاز ہے کہ اس کی تدوین اور تہذیب ملفوظات کے روایتی طریقۂ نگارش کے مطابق نہیں کی گئی، بلکہ اسے مختلف کتب و رسائل کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس مجموعے میں بیس موضوعات کے زیرِ عنوان شیخ الاسلام کے اقوال اور ارشادات درج ہیں۔ ان اقوال میں اختصار بھی ہے اور جامعیت بھی؛ معنوی آبداری بھی ہے اور فکری ہنر کاری بھی؛ ان میں بیان کی سادگی بھی ہے اور مطالب کی گہرائی بھی؛ ان میں خوش وقتی کا احساس بھی ہے اور راحتِ دل کا سامان بھی؛ ان میں خیال کا اچھوتا پن بھی ہے اور برجستگیِ اظہار کا قرینہ بھی؛ ان میں شریعت اور طریقت کے معارف بھی ہیں اور حقیقت و معرفت کے نکات بھی؛ ان میں پند و نصائح کا رنگ بھی ہے اور حقائق و عرفان کا آہنگ بھی؛ ان میں اخلاص کی رعنائی بھی ہے اور محبت کی خوشبو بھی۔ ۴۴ صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ اختصار اور جامعیت کی عمدہ مثال ہے۔ ماخذ اور مصادر میں ۲۵ کتابیں شامل ہیں۔ ان کتابوں سے فاضل مرتب نے شیخ الاسلام کے فرمودات اخذ کیے ہیں اور انھیں اس طرح سلکِ احساس میں پرویا ہے کہ دُرِ بے بہا جگمگا اُٹھے ہیں۔

جلال پور شریف کا ملفوظاتی ادب:

[۲]

نفحات المحبوب فی احیاء القلوب (۷) پیر غلام حیدر شاہ جلال پوری (م ۱۹۰۸ء/ ۱۳۲۶ھ) کے ملفوظاتِ گرامی کا مجموعہ ہے۔ اس کے مرتب اور جامع صوفی نور عالم جہلمی حضور جلال پوری کے دامن گرفتہ تھے۔ انھوں نے نہایت عقیدت اور ارادت سے اپنے شیخ کی مجالس کی روداد نگاری کا فریضہ انجام دیا۔ وہ پہلی بار ۱۲۔ رمضان ۱۲۹۴ھ کو بارگاہِ جلال پور میں باریاب ہوئے اور غلامی کی مسندِ خوش آثار پر جلوہ آرا ہوگئے۔ انھوں نے ملفوظات نگاری کا آغاز ذی قعدہ ۱۳۰۲ھ میں کیا، لیکن بوجوہ اس سلسلۂ کو جاری نہ رکھ سکے۔ آٹھ سال بعد دوبارہ ان مجالس کے مناظر کی عکس گری میں مصروفِ کار ہوئے، تو شوق کی رہبری اور شیخ کے فیضانِ نظر کی کرم فرمائی نے اس جادۂ محبت کو طے کرنے میں ان کی یاوری کی اور وہ کامگار ہوئے۔ یہ مجموعۂ ملفوظات مرتب کے سولہ برسوں کی محنت کا ثمر ہے۔ پہلی اور آخری بار ۱۹۰۹ء میں کارخانۂ بلالی سٹیم پریس، ساڈھورہ کے زیرِ اہتمام طباعت آشنا ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ اس مجموعے میں ۶۶ مجالس کی روداد اور ان کا احوال شامل ہے۔ آخر میں صوفی نور عالم نے اپنے شیخ کی رحلت اور ان کی تدفین کا حال بھی رقم کیا ہے۔ کتاب میں منظومات کی بھی خاصی تعداد موجود ہے اور ان میں سے اکثر منظومات جامعِ ملفوظات کے حسنِ تخلیق کا ثمر ہیں۔ یہ مجموعہ ۲۷۲ صفحات پر محیط ہے اور فارسی زبان میں ہے۔

ذکرِ حبیب (۸) پیر غلام حیدر شاہ جلال پوری کے احوال، کرامات اور ملفوظات کا نہایت ہی قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ اس کے مؤلف ملک محمد الدین ہیں، جنھوں نے اپنے شیخ کے احوال و آثار کو نہایت محبت اور عقیدت سے مرتب کیا۔ یہ کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ کتاب کا حصۂ سوم ملفوظات پر مشتمل ہے، جسے مؤلفِ کتاب نے **ملفوظاتِ حیدری** کے عنوان سے موسوم کیا۔ یہ حصہ کتابِ مذکورہ کے صفحہ ۴۱۲ سے ۶۸۰ تک پھیلا ہوا ہے، یعنی یہ ملفوظاتی حصہ ۱۶۸ صفحات پر محیط ہے۔ اس مجموعے کے زیادہ تر ملفوظات صوفی نور عالم کے ملفوظاتی مجموعے **لمحات المحبوب فی احیاء القلوب** کے ترجمے اور تلخیص پر مبنی ہیں۔ بہت ہی کم ملفوظات ایسے ہیں، جو ملک محمد الدین نے کسی دوسرے ذریعے، یا حوالے سے جمع کیے ہیں۔ یہ ملفوظات کتابی صورت میں مرتب ہونے سے قبل مؤلفِ کتاب کے علمی اور ادبی جریدے **صوفی** پنڈی بہاء الدین میں بھی قسط وار اشاعت پذیر ہوتے رہے ہیں۔

ذکرِ حبیب پہلی بار ۱۳۴۲ھ میں چھپی تھی۔ دوسری بار ۱۴۰۴ھ میں اشاعت آشنا ہوئی، جبکہ اس کا تیسرا ایڈیشن ضیاء القران پبلی کیشنز، لاہور کے اہتمام سے ۱۴۲۳ھ میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔

یہ ملفوظات پیر غلام حیدر شاہ کے اندازِ گفتار کی گل افشانی کا عمدہ مرقع ہیں۔ مؤلف نے جو ملفوظات مختلف راویان کے توسط سے جمع کیے ہیں، ان کی ترسیل اور روایت میں راویوں کا ذکر بھی کیا ہے، لیکن وہ تمام ملفوظات جو **لمحات المحبوب** سے اخذ کیے گئے، ان کا کہیں بھی حوالہ نہیں دیا۔ ان کی ترتیب و تہذیب سے یوں معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ ان کے شنیدہ ہیں، لیکن ایسا نہیں۔ مؤلف ۱۹۰۶ء میں مرید ہوئے اور ان کے مرتبہ مجموعۂ ملفوظات میں کچھ ایسے ملفوظات بھی ہیں، جو ۱۹۰۶ء سے قبل کی منعقدہ مجالس میں موضوعِ گفتگو بنے۔ انھیں ماہ و سال کی تعین کے ساتھ صوفی نور عالم نے اپنے مجموعے کی زینت بنایا تھا۔

صوفی نور عالم جہلمی نے اپنے پیر و مرشد کے احوال اور ملفوظات میں **لحات المحبوب** کے علاوہ ایک دوسری کتاب بعنوان **احیاء القلوب** المعروف بہ **مقامات المحبوب**(۹) بھی لکھی تھی۔ یہ کتاب کبھی اشاعت آشنا نہیں ہوئی اور اب تو اس کا ایک ہی قلمی نسخہ موجود ہے۔ منحصر بہ فرد یہ نسخہ صاف اور خوانا تو ہے، مگر کئی مقامات پر اس کے صفحات پھٹ گئے ہیں اور یوں کلی طور پر اس کا متن محفوظ نہیں اور نہ ہی اس کی بازیافت ممکن ہے۔ مذکورہ نسخہ قاضی محمد رئیس احمد قادری کا مملوکہ ہے۔ برادرِ عزیز حسن نواز شاہ [مخدومہ امیر جان لائبریری، نڑالی، گوجر خان] کی کرم فرمائی سے راقم کو اس کی عکسی نقل میسر آئی۔ اس مجموعے میں پیر سید غلام حیدر شاہ جلال پور شریف کے احوال اور ملفوظات میں نہایت ہی قیمتی مواد موجود ہے۔ یہ متاعِ بے بہا **لحات** پر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر اس نسخے کے خوانا اور محفوظ متن کو مدون کر دیا جائے، تو حضرت جلال پوری کی پُر انوار زندگی کے کئی گوشے اور ان کی گفتگوئے دلنواز کے کئی منظر جلوہ گر ہو جائیں گے۔

گولڑہ شریف کا ملفوظاتی ادب:

[۳]

خزینۂ انوار و گنجینۂ اسرار موسوم بہ **ملفوظاتِ طیبہ**(۱۰) قبلۂ عالم پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف (م ۱۹۳۷ء) کے ملفوظاتِ طیبات کا گراں ارزش مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ اصلاً فارسی میں ہے۔ اس کے دو حصے ہیں۔ حصۂ اول ۵۸ ملفوظات پر مشتمل ہے اور اس کے جامع مولوی گل فقیر احمد پشاوری ہیں۔ دوسرا حصہ ۱۳۶ ملفوظاتِ گرامی پر محیط ہے اور اس کے مرتب مولوی عبدالحق سسرالوی ہیں۔ ہر دو جامعین حضور قبلۂ عالم گولڑہ شریف کے دامن گرفتہ اور فیض یافتہ تھے۔ پیر صاحب غریب نواز ان مجالس میں اپنی علاقائی زبان میں گفتگو فرماتے تھے، جبکہ مرتبینِ ملفوظات نے ان مجالس کے مناظر اور ان کی احوال نگاری فارسی زبان میں قلم بند کی۔ مولوی فیض احمد فیض رقم طراز ہیں کہ:

''ان حضرات نے آپ کی گفتگو کو، جو عموماً علاقائی زبان میں ہوتی تھی، فارسی کا جامہ پہنایا''۔(۱۱)

فارسی ایڈیشن ۱۳۵۳ھ میں طباعت آشنا ہوا۔ اس کا سرورق اپنے عہد کے نامور کاتب مولوی عبدالمجید زریں رقم کے حُسنِ قلم کا آئینہ دار ہے۔ مجموعے کی کتابت کا شرف نور عالم کو حاصل ہوا، جنھوں نے نہایت عقیدت اور محبت سے اس مجموعے کو اپنے حُسنِ کتابت سے مزین کیا۔ یہ مجموعہ منشی عبدالجبار کے زیرِ اہتمام صابر الیکٹرک پریس، لاہور سے اشاعت پذیر ہوا۔ اس کے صفحات کی تعداد ۲۰۷ ہے۔

خزینۂ انوار و گنجینۂ اسرار چشتیہ سلسلے کے ملفوظاتی ادب میں منفرد اور ممتاز مقام و مرتبے کا حامل ہے۔ اس مجموعے میں اتنے علمی اور فکری مسائل زیرِ بحث آئے ہیں کہ کوئی بھی دوسرا مجموعہ اتنے معارف کا خزینہ دار نہیں رہا۔ وحدۃ الوجود اور اس کے وجدانی رویوں کی تعبیر اور تفسیر اس مجموعۂ ملفوظات کا اساسی پہلو رہا ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابنِ عربی کے مکاشفاتی اور وجدانی نظریات پر جیسی دسترس حضور قبلۂ عالم کو میسر رہی ہے، ایسی مہارت تو بیسویں صدی کے کسی بھی عالم اور صوفی کا مقسوم نہیں رہی۔ وہ اپنی خاص مجالس میں اس عرفانی عقیدے پر گفتگو فرماتے تھے۔ بعض اوقات وہ اس مسئلے کے اظہاریے میں **فصوص** اور **فتوحات** کے مندرجات کی عارفانہ توجیہہ بھی فرماتے تھے۔ اس اعتبار سے یہ مجموعۂ ملفوظات: ملفوظاتی ادب کی تاریخ میں بالکل نئے رنگوں کا آئینہ دار ہے۔ اس میں حکایات کی تمثیلی معنویت سے اخذِ معانی کا وہ رنگ نہیں رہا، جو اس سے قبل مجموعوں کا طرۂ امتیاز رہا ہے، بلکہ ان کے برعکس یہ

مجموعہ اپنے فکری اور معنوی رنگ وآہنگ کی ترجمانی میں نئے آہنگ کی بصیرت افروزی کا عکاس ہے۔ اس مجموعے میں وجدانی اور عرفانی مراحلِ سلوک کی علمی اور فکری بنیاد فراہم کی گئی ہے۔علم اور معرفت کی یگانگت اور یکجائی سے جہانِ معنی کی ایک نئی اور خوش آثار دنیا منکشف ہوئی ہے۔ حافظ شیرازی کی ایک غزل کی ایسی وجدانی اور مکاشفاتی تفہیم کی گئی ہے کہ حافظ کا کوئی دوسرا شارح فکر وآہنگ کی ترجمانی میں اس قدر کامگار نہیں رہا۔ قرآن وحدیث اور عارفانہ اقوال کے پہلو بہ پہلو ،اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں،اشعار کا برمحل استعمال اس مجموعے کا ایک اور اختصاصی پہلو ہے۔مولوی فیض احمد فیض نے اس دُرِ بے بہا کا اردو میں ترجمہ کیا۔ وہ رقم طراز ہیں کہ:

''فارسی ایڈیشن میں کتابت اور طباعت کی کافی اغلا ط باقی رہ گئی تھیں، اس لیے نیاز مند عرصے سے متمنی تھا کہ اس مجموعے کا اصل قلمی مسودے کے ساتھ مقابلہ کر کے پوری تصحیح کے بعد اس کا سلیس اردو ترجمہ منظر عام پر لایا جائے۔ مجھ سے پہلے حضرت قبلۂ عالم قدس سرہ کے مخلص اور مستفیض استاذ العلما حضرت الشیخ الجامع جناب مولانا غلام محمد صاحب گھوٹوی ثم بہاول پوری اور حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب بنگوی مترجم **تحقیق الحق** نے بھی اس طرف توجہ فرمائی ،مگر یہ سلسلہ نامکمل ہی رہا۔ بالآخر اس نیاز مند نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اور ترجمہ وتصحیح اور ترتیب میں قدرے ترمیم کے علاوہ مناسب مواقع پر ان ملفوظات کا مزیدار اضافہ بھی کر دیا ، جو حضرت قبلۂ عالم قدس سرہ کے فرزندِ ارجمند قبلہ بابو جی مدظلہ العالی سے سننے کا اتفاق ہوا اور بعض ملفوظات کے آخر میں مناسب فوائد ونتائج بھی اپنی طرف سے شامل کر دیئے ۔جیسا کہ ملفوظات کے جمع کرنے والے حضرات نے بھی مناسب مقامات پر کیا تھا۔ چنانچہ اس مجموعے میں حضرت قبلۂ عالم قدس سرہ کے علاوہ جہاں محرر سطور یا راقم الحروف کے الفاظ کے ساتھ کچھ اضافہ ہے، وہ ملفوظات کے جمع کرنے والوں کی طرف سے ہے اور مترجم کے ساتھ جہاں کچھ تحریر ہے وہ اس نیاز مند کی طرف سے ہے۔ میرے خیال میں یہ مجموعہ مقولۂ مشہورہ:عصای پیر بجای پیر حضرت قبلۂ عالم قدس سرہ سے عقیدت رکھنے والوں کے لیے تبرک ہونے کے علاوہ آں جناب کے مسلک ومشرب کا بھی کسی حد تک آئینہ دار ہے''۔(۱۲)

مولوی صاحب موصوف بھی قبلۂ عالم کے مرید اور عقیدت گزار تھے۔ وہ ساری زندگی اپنے شیخ کی بارگاہِ عرش مقام میں اقامت گزیں رہے اور وہیں وفات پائی ۔انھوں نے اپنے پیر ومرشد کی فارسی کتابوں کے اردو ترجمے کیے اور ان کی ترتیب وتہذیب کا فریضہ بھی انجام دیا۔ وہ **مہرِ منیر** کے مصنف بھی تھے۔پیر صاحب غریب نواز کے ملفوظاتِ گرامی کا اردو ترجمہ **مقالاتِ مرضیہ** المعروف بہ **ملفوظاتِ مہریہ** کے عنوان سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا ۔اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

مہرِ منیر (۱۳) پیر مہر علی شاہ گولڑہ شریف کی سوانح عمری ہے، جسے ان کے مریدِ باصفا مولانا فیض احمد فیض (م۲۰۔دسمبر ۲۰۰۵ء) نے مرتب کیا۔اس سوانح عمری میں قبلۂ عالم کی شخصی، علمی ،تہذیبی اور روحانی زندگی کے متنوع رنگ آشکار ہوئے۔صاحبِ تالیف نے اس کتاب میں پیر صاحب غریب نواز کے ملفوظات کا ایک عمدہ انتخاب بھی مرتب کیا۔ اس ملفوظاتی انتخاب میں بیشتر ملفوظ تو ان کے مترجمہ مجموعے **ملفوظاتِ مہریہ** سے ماخوذ ہیں،لیکن کئی مقامات پر ایسے ملفوظات بھی آئے ہیں، جو پہلی بار اس کتاب کی وساطت سے نظر

نواز ہوئے۔ان ملفوظات کے جامع اورراوی پیر صاحب کے مریدِ خاص اور عالمِ اجل مولانا غلام محمد گھوٹوی(م۱۹۴۸ء) ہیں۔**مہرِ منیر** ے فاضل مؤلف نے یہ ملفوظات مولانا موصوف کی بیاضوں سے اخذ کیے اور انھیں اپنی کتاب میں نگینوں کی طرح پُرو دیا۔ان کی مہکار قارئین کے مشامِ جاں کو معطر رکھتی ہے اور انھیں اس فضا سے باہر نکلنے نہیں دیتی۔مولانا کے مرقومہ ملفوظات میں ان کے شیخ کی جمال افروز زندگی کے رنگ بھی دکھائی دیتے ہیں اور ان کی خوش گفتاری کے مناظر بھی۔ان میں زندگی کے خوش آثار رویوں کی بہار دیدنی ہے۔جامعِ ملفوظات کو اپنے شیخ کی علمی اور روحانی مجالس میں حاضر باشی کی سعادت بھی حاصل رہی اور بعض اسفار میں انھیں ہم سفری کا اعزاز بھی میسر رہا، لہٰذا وہ ملفوظات کی روایت اور ترجمانی میں اپنے ہم عصروں سے منفرد اور ممتاز رہے۔اگر ان کے مرتب کردہ یہ ملفوظات کبھی اپنی مکمل صورت میں جلوہ گر ہو گئے ،تو ملفوظاتی ادب کی تاریخ اور روایت میں نمایاں مقام اور مرتبے کے حامل ہوں گے۔

مہرِ منیر میں **ملفوظاتِ مہریہ** اور مولانا غلام محمد گھوٹوی کے روایت کردہ ملفوظات کے علاوہ بھی کئی ملفوظاتی ادب پارے اس کتاب کی زینت ہیں،جو اپنے معنوی اور جمالیاتی آہنگ میں منفرد بھی ہیں اور ممتاز بھی۔

ضیائے مہر(۱۴) پیر سید غلام محی الدین گیلانی المعروف بہ بابو جی غریب نواز (م۲۱۔جون۱۹۷۴ء) کے احوال اور ملفوظاتِ گرامی کا مجموعہ ہے ۔اس مجموعے کے مؤلف مولانا مشتاق احمد چشتی ہیں۔یہ کتاب گیارہ ابواب پر مشتمل ہے۔نویں باب کی دو فصلیں فرمودات اور ملفوظات پر محیط ہیں۔ان ملفوظات میں صاحبِ ملفوظ کی روحانی زندگی کا تموج اور ارتفاع بھی دکھائی دیتا ہے اور ان کی خوش کلامی کے مظاہر کی باز آفرینی کے مناظر بھی سامنے آتے ہیں۔بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

وہ خوش کلام ہے ایسا کہ اس کے پاس ہمیں
طویل رہنا بھی لگتا ہے مختصر رہنا

بابو جی غریب نواز کی مجالس کی کیفیات کا سوزِ دروں کسی حد تک ان کے ملفوظات کے تناظر میں رقص کناں ہے،لیکن اس کی مکمل تعبیر کا ادراک لفظ کی گرفت سے باہر رہتا ہے ۔ملفوظات کے حجرے میں مراقبہ کرتے لفظ: صاحبِ ملفوظ کے داخلی جذبوں کی تفہیم کا حق ادا نہیں کر سکتے۔حسنِ ادا کے اشارات سے کسی بھی شخصیت کے باطن کی تصویر کشی کہاں ممکن ہے؟ کیونکہ اس کے سینۂ دل پر نزول کرتے ہوئے مناظر لفظ کے آنگن میں اترنے سے گریزاں رہتے ہیں اور یوں ملفوظ کے پیکر میں بکھرتی ہوئی خوشبو محسوس تو کی جا سکتی ہے ،لیکن شاید اسے کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

تذکرہ والیِ دامان (۱۵) اٹل شریف کے خواجہ محمد امیر (م۳۔ربیع الاول ۱۳۴۵ھ/۱۱۔ستمبر ۱۹۲۶ء) کے احوال و ملفوظات کا مجموعہ ہے۔اس کے مؤلف ڈاکٹر ایم عطاء اللہ راز ہیں۔موصوف پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑہ شریف کے مجاز تھے ۔اس مجموعے میں ان کے احوال و آثار کی ترقیم کے ساتھ ساتھ ان کے ملفوظاتِ گرامی کا احاطہ بھی کیا گیا ۔مرتب رقمطراز ہیں کہ:

> ''اس مادہ پرستی کے دور میں کہ قلب و روح کو حرص و ہوس ،حسد و بغض اور کینہ و ریا نے مسموم کر دیا ہے،جس سے انسان کے کردار کے اعلیٰ اوصاف زنگ آلود ہو چکے ہیں۔ایسی صورت حال میں بزرگانِ دین کے حالات و واقعات اور ان کے ارشادات و نصائح کا بیان نسیمِ جانفزا سے کم نہیں ہیں،جن کے تذکرے سے آج ارواح کو فرحت وانبساط کی دولت میسر آتی ہے اور جن کے انوار سے قلوب جادۂ مستقیم پا کر دولتِ لازوال کے حامل ہو جاتے ہیں''۔(۱۶)

یہ ملفوظات (ص ۹۹ تا ۱۳۴) پینتیس صفحات پر مشتمل ہیں۔یہ فرمودات مختلف راویوں کی روایت سے مرتب ہوئے۔اس مجموعے میں خواجہ شمس الدین (م ۹ ۔ رجب ۱۳۸۲ھ) کے ملفوظات بھی شامل ہیں۔یہ ملفوظات (ص ۱۹۷ سے ۲۱۴) سترہ صفحات پر محیط ہیں۔ہر دو بزرگوں کے ملفوظات میں چشتیہ رنگ کی تابناکی اور تازگی کے مناظر بکھرے ہوئے ہیں۔ان میں دردمندی بھی ہے اور دلداری بھی؛اظہار کی چاشنی بھی ہے اور محبت کی رنگینی بھی۔خواجہ محمد امیر وحدۃ الوجودی رنگِ سخن کے ترجمان تھے۔ پیر صاحب گولڑہ شریف کے نام ان کے علمی اور روحانی استفسارات ان کی بلندیِ احوال کے گواہ ہیں۔ ان ملفوظات میں بھی ان کا عارفانہ تفکر جلوہ فرما ہے۔وجدانی اور مکاشفاتی جذبوں کی بوقلمونی ان ملفوظات کے بین السطور اپنی رعنائی اور شادابی کے نئے منظروں کا پیش خیمہ ہے۔روحانی کرب : خوش کلامی کے تخلیقی اظہارات میں ڈھل کر ملفوظاتی ادب میں جلوہ نما ہوتا ہے،تو اس کے کومل اور سجل رنگوں کا جمالیاتی اسلوب نکھر کر ایک نئی دنیا کا پیش نامہ مرتب کرتا ہے۔

معظم آباد شریف کا ملفوظاتی ادب:

[۴]

ہو المعظم (۱۷) خانقاہِ معظمیہ کی روحانیت کی سو سالہ تاریخ ہے، جسے صاحبِ طرز انشا پرداز اور درویش صفت شاعر پروفیسر غلامِ نظام الدین نے اپنے حسنِ خیال کی رعنائی اور موقلم کی زیبائی سے مزین کیا۔وہ رقم طراز ہیں:

> ''**ہو المعظم** کی نوعیت؟۔۔۔مواد کی کمی کی وجہ سے **ہو المعظم** میں ہم تاریخ یا سوانح نگاری کے تقاضے پورے نہیں کر سکے۔ ملفوظات کی کتاب بھی اسے نہیں کہہ سکتے۔لہذا یہ ایک تذکرہ نما سی چیز ہے۔اس میں مختصر سوانحی خاکے بھی ہیں اور انھی کے ضمن میں حضرات کے ملفوظات اور باطنی کیفیات کا سراغ مل جاتا ہے''۔(۱۸)

اس مجموعے میں خواجہ معظم الدین (م ۹۔جمادی الثانی ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء) اور ان کے بعد آنے والے بزرگوں کے احوال بھی ہیں اور ان کے ملفوظات بھی۔ یہ مجموعہ براہِ راست ملفوظاتی مجموعہ تو نہیں ،لیکن پورے مجموعے میں ملفوظات کی فکری اور معنوی لہریں محوِ سفر ہیں۔ ہر سطر کے بین السطور ملفوظات کی خوشبو اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔اس مجموعے میں ملفوظات کی جمالیاتی اپیل اس کے معنوی رویوں کو اس مدار میں رکھنے میں کوشاں ہے ،جو ان صاحبانِ خوش خیال کی خوش گفتاری کے ترجمان ہیں۔اس میں ان کی باطنی کیفیات کا آہنگ ان کی خوش خرامی سے بھی منکشف ہے اور ان کی گل افشانیِ گفتار سے بھی۔اس میں ان کے انفاسِ جاں کا رنگ بھی نمایاں ہے اور ان کی واردات کا آہنگ بھی۔ان کی مجالس میں زندگی اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ ہویدا ہے :

ان کی محفل میں آن کر دیکھو
زندگی کتنی خوب صورت ہے

ملفوظاتِ سدیدیہ (۱۹) حافظ غلام سدید الدین معظم آبادی کے ملفوظاتِ گرامی کا نہایت ہی عمدہ مجموعہ ہے۔اس کے مرتب صاحبِ ملفوظ کے پوتے معین نظامی ہیں۔اس مجموعے میں: معین نظامی کے علاوہ مولوی محمد اقبال سدیدی، محمد اکرم سدیدی،حکیم عبدالرحمٰن مخدوم اور صفدر حسین حامد کے جمع کردہ ملفوظات شامل ہیں۔یہ مجموعہ رجب ۱۴۱۰ھ رفروری ۱۹۹۰ء میں اشاعت آشنا ہوا۔ سرورق امام الخطاطین حافظ محمد یوسف سدیدی کے حسنِ قلم کا شاہکار ہے۔معین نظامی کی یہ پیش کش مکتبۂ معظمیہ،خانقاہِ معظمیہ معظم

آباد کے اہتمام سے روشناسِ خلق ہوئی۔۱۵۹صفحات پر مشتمل یہ مجموعہ سلسلۂ چشتیہ کی روایتی اورملفوظاتی خوشبو سے مہک رہا ہے۔

صاحبِ ملفوظات کی شخصیت کا سحر ہے یا کیا کہ ان ملفوظات کا مطالعہ کرتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ہم ان کی مجلس میں موجود ہوں اور ان کے خیالاتِ زریں قطرۂ ہائے شبنم کی طرح ہمارے سینۂ دل پر اُتر رہے ہوں۔بارشِ عرفان میں بھیگتے لوگ کسی ایسی دنیا کے راہی بن جاتے ہیں،جوسوز و ساز کی فلک سرشت کیفیات سے عبارت ہوتی ہے۔ایسی مجالس کے پُر اثر لمحات کی عکس گری قلبِ سلیم کی شادابی کا باعث بھی ہوتی ہے اوراس کی حیاتِ دوام کا سبب بھی۔۔۔اور ایسے کئی مناظر اس مجموعۂ ملفوظات میں عکس انداز ہیں،جوفطرتِ سلیم کے روحانی ارتفاع اور اس کی فکری بالیدگی کے لیے اکسیر کا درجہ رکھتے ہیں ۔

یہ مجموعۂ ملفوظات:سلسلۂ چشتیہ کے ملفوظاتی ادب میں اس حوالے سے منفرد اور ممتاز حیثیت کا حامل ہے کہ اس کے جامعین میں کئی عقیدت کیش شامل ہیں۔

مکان شریف کا ملفوظاتی ادب:

[۵]

ہو الحمید(۲۰)میاں عبد الحمید(م۹۔رجب ۱۳۹۷ھ/۲۷۔جون ۱۹۷۷ء) کے احوال ا ور ملفوظات پر مبنی مجموعۂ مناقب ہے ، جسے محمد مسعود احمد نے ترتیب دیا ہے۔ یہ مجموعہ دسمبر۱۹۹۲ء/رجب ۱۴۱۳ھ میں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ اس کے صفحات کی کل تعداد تین سو تین ہے۔اس میں ملفوظات کا حصہ باون صفحات (ص۱۳۳ تا ۱۸۵) کو محیط ہے۔ہر ملفوظ کا آغاز لفظ'فرمایا' سے ہوتا ہے۔۹۴ ملفوظات اس مجموعے کی زینت ہیں۔مرتبِ ملفوظات رقم طراز ہیں کہ:

> ''یہ ملفوظات : ملفوظ نویسی کی روایت کے مطابق مجالس کی صورت میں قلم بند نہیں کیے گئے،بلکہ آپ کے اُن ارشاداتِ عالیہ پر مبنی ہیں،جو آپ نے مختلف مواقع پر جزوی طور پر ارشاد فرمائے۔ان میں سے چند ایک تو خود میں نے نوٹ کیے ، لیکن زیادہ تر روایتاً مجھ تک پہنچے ہیں۔حضرت صاحبزادہ عزیز احمد صاحب ، سجادہ نشین مکان شریف کفری نے ملفوظات کے مسودے پر خاص طور پر نظرِ ثانی کی اور بعض مقامات پر اصلاح بھی فرمائی''۔(۲۱)

اس مجموعۂ ملفوظات اور مناقب کے فکری آفاق :حسنِ خیال کی اس تابناکی سے ثمر بار ہیں،جوخیالِ حسن کی رعنائی کا اشاریہ بھی ہوتا ہے اور اس کی زیبائی کا اظہار یہ بھی؛ اس مجموعے میں وجودِ وحدت کی بے رنگی کے مناظر بھی ہیں اور وجودِ امکاں کی رنگا رنگی کے مظاہر بھی؛اس میں تمثیل کی خوشبو بھی ہے اور خیال کی تجسیم بھی؛اس میں نشاطِ زیست کا آہنگ بھی ہے اور جمالِ یار کا رنگ بھی۔ پروفیسر غلام نظام الدین نے لکھا ہے کہ:

> ''حضرت میاں صاحب بہت کم بولتے تھے۔ بولتے کیا تھے؟موتی رولتے تھے۔لہجہ اتنا ملائم اور آواز اتنی دھیمی تھی کہ سننے والے کو ہمہ تن گوش ہو کر سننا پڑتا تھا اور میاں صاحب کی بات محض مدعا سے وابستہ ہوتی تھی ۔ اِدھر اُدھر کی باتیں اور گپ شپ کا وہاں کوئی امکاں نہ تھا۔ان کی گفتگو ابرِ کرم کی ہلکی پھوار کی مانند دل پذیر اور خوش گوار تھی''۔(۲۲)

اس مجموعے میں اشعار کا برمحل اور برجستہ اظہار:ملفوظاتی فضا کو گنجینۂ معانی کی طلسماتی اپیل کا ایسا پیش منظر عطا کرتا ہے کہ

جس سے اس کے بین السطور خوش رنگ اور ابد تاب ماحول کی تازگی اور شادابی کے مظاہر اور مناظر پھیل کر بکھر جاتے ہیں اور اس طرح اس کی معنوی تہ داری کا آہنگ نئے زمانوں کی نوید بن جاتا ہے۔

حواشی اور حوالے

۱۔ **تاریخِ مشائخِ چشت**: ادارۂ ادبیات، دلی: ۱۹۸۴ء: ص ۴۳۰

۲۔ **مرآۃ العاشقین**: سید محمد سعید زنجانی: مصطفائی پریس، لاہور: ۱۳۰۲ھ: ۲۵۲ ص

۳۔ کتاب کے اختتام پر ذی قعدہ ۱۳۰۲ھ کی تاریخ طباعت درج ہے، جبکہ سرورق پر سنۂ اشاعت ۱۳۰۳ھ لکھا گیا ہے۔ ممکن ہے کہ کتاب کی اشاعت ۱۳۰۲ھ میں عمل میں آئی ہو اور ایک مہینے بعد نئے سال (۱۳۰۳ھ) کے آغاز میں اس کا سرورق چھپا ہو۔ واللہ اعلم

۴۔ **پُر گوہر**: تصوف فاؤنڈیشن، لاہور: ۱۴۱۹ھ/۱۹۹۸ء: ص ۱۰

۵۔ **انوارِ قمریہ** (جلد اول): قاری غلام احمد [مرتب]: دارالعلوم قمر الاسلام سلیمانیہ، کراچی: بارِ اول اپریل ۲۰۰۲ء: ۳۷۲ ص

انوارِ قمریہ (جلد دوم): قاری غلام احمد [مرتب]: دارالعلوم قمر الاسلام سلیمانیہ، کراچی: بارِ اول مارچ ۲۰۰۳ء: ۳۰۴ ص

انوارِ قمریہ (جلد سوم): قاری غلام احمد [مرتب]: دارالعلوم قمر الاسلام سلیمانیہ، کراچی: بارِ اول اپریل ۲۰۰۴ء: ۳۵۹ ص

۶۔ **شریعت و طریقت کے نیّرِ تاباں۔ شیخ الاسلام حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی**: ڈاکٹر خالق داد ملک: ادارۂ تعلیماتِ اسلاف، لاہور: س ن: ۴۴ ص

۷۔ **نفحات المحبوب فی احیاء القلوب**: صوفی نور عالم جہلمی: کارخانۂ بلالی سٹیم پریس، ساڈھورہ: ۱۹۰۹ء: ۳۷۲ ص

۸۔ **ذکرِ حبیب**: صوفی محمد الدین: ادارہ حزب اللہ، جہلم: بارِ سوم ۱۴۲۳ھ: ۲۰۷ ص

۹۔ **احیاء القلوب** المعروف بہ **مقامات المحبوب** (قلمی): صوفی نور عالم جہلمی: مملوکہ قاضی محمد رئیس احمد قادری

۱۰۔ **خزینۂ انوار و گنجینۂ اسرار** موسوم بہ **ملفوظاتِ طیبہ**: عبد الحق سسرالوی و گل فقیر احمد پشاوری: صابر الیکٹرک پریس، لاہور: ۱۳۵۳ھ: ۱۸۴ +۲۳= ۳۰۷ ص

۱۱۔ **مقالاتِ مرضیہ المعروف بہ ملفوظاتِ مہریہ**: پرنٹنگ پروفیشنلز، لاہور: بارِ پنجم ۱۴۲۸ھ/۲۰۰۷ء: ص ۲

۱۲۔ محولہ بالا: ص ۲۔۳

۱۳۔ **مہرِ منیر**: مولانا فیض احمد فیض: پرنٹنگ پروفیشنلز، لاہور: بارِ دوازدہم ذیقعد ۱۴۲۷ھ/دسمبر ۲۰۰۶ء: ۶۳ ص

۱۴۔ **ضیائے مہر**: مولانا مشتاق احمد چشتی: ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور: بارِ دوم س ن: ۳۵۲ ص

۱۵۔ **تذکرہ والیِ دامان**: ڈاکٹر ایم عطاء اللہ راز: دربارِ عالیہ اٹل شریف، تحصیل کلاچی: س ن

۱۶۔ محولہ بالا: ص ۱۵۔۱۶

۱۷۔ **ہو المعظم**: پروفیسر غلام نظام الدین: اسلامک بک فاؤنڈیشن، لاہور: ۱۳۹۹ھ/۱۹۷۹ء: ۳۶۱ ص

۱۸۔ محولہ بالا: ص ۱۴

۱۹۔ **ملفوظاتِ سدیدیہ**: معین نظامی: مکتبۂ معظمیہ، خانقاہِ معظمیہ معظم آباد: ۱۹۹۰ء/۱۴۱۰ھ: ۱۵۹ ص

۲۰۔ **ہو الحمید**: محمد مسعود احمد: آستانۂ عالیہ، مکان شریف، کفری، خوشاب: بارِ اول ۱۹۹۲ء

۲۱۔ محولہ بالا: ص ۱۳۴

۲۲۔ **ہو المعظم**: ص ۳۲۴

ڈاکٹر ناصر عباس نیر
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبۂ اُردو، اورینٹل کالج، لاہور

اردو میں مغربی تنقید کی نصابی کتب

This article aims at investigating the nature of influence of Western criticism on Urdu criticism, particularly on the books prepared for and according to the educational needs of students of Urdu literature at different times in 20th century. The author has derived on the conclusion that books in reference demonstrate multiple kinds of influence. Some books are literal translations of selected chapters or parts or paragraphs of few books of English criticism, usually secondary ones. It has been noted as an unethical fact that writers of these Urdu books have'nt bother to mention the names of books of English criticism they are relying on. The article concludes the article mentioning those few books that show the scholarly acumen of their authors.

مغربی تنقید سے اردو کا ربط ضبط بالعموم تین سطحوں پر ہوا ہے : ثقافتی، نصابی اور دانش ورانہ۔ اس ربط ضبط کی تاریخ دیکھی جائے تو ترتیب بھی یہی بنتی ہے۔ اس تاریخی ترتیب نے مغربی تنقید کے مخصوص متن اور اس متن کی مخصوص تعبیر کو اردو میں رائج کیا ہے۔ اگر یہ ترتیب مختلف ہوتی، مغربی تنقید سے اردو کا واسطہ خالصتاً دانش ورانہ طلب کے تحت اور دانش ورانہ سطح پر پڑتا تو نتائج یک سر مختلف ہوتے، مگر چوں کہ اردو ذہن، مغربی تنقید سے اُس ثقافتی فضا میں اوّل اوّل مانوس ہوا (یا کرایا گیا) جو اپنی نوعیت اور عمل میں نوآبادیاتی تھی، اس لیے 'مغربی تنقید' سے اردو کی نصابی اور دانش ورانہ وابستگی بھی اس ثقافتی فضا سے متاثر و متعین ہوئی ہے۔ بعض مقامات پر دانش ورانہ وابستگی 'نوآبادیاتی حصار' سے آزاد ہونے میں یقیناً کام یاب ہوئی ہے مگر یہ رائے نصابی سطح سے متعلق دینا بہت مشکل ہے۔

مبادا غلط فہمی پیدا ہو، یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ 'نوآبادیاتی ثقافتی فضا' کئی طریقوں سے عمل آرا ہوتی ہے، جن میں بعض بلا واسطہ اور بعض بالواسطہ ہوتے ہیں۔ براہ راست طریقے تو فی الفور نظر آ جاتے ہیں، مگر بالواسطہ حربوں کو سمجھنا اور انھیں منکشف کرنا آسان نہیں ہوتا۔ بالواسطہ حربوں میں اہم حربہ یہ ہے کہ نوآبادیاتی حقیقی ثقافتی روح تک رسائی سے، مقامی ذہن کو محروم رکھا جائے۔

نوآبادکار کبھی نہیں چاہتا کہ مقامی ذہن، نوآبادکار کی ثقافت اور فکر کی اصل تک پہنچ کر ثقافتی وفکری سطح پر اس کی برابری کے قابل ہو اور برابری کا دعویٰ کرے۔ اس کے لیے نوآبادیاتی اداروں اور' آئیڈیالوجیکل سٹیٹ اپریٹس' کے تحت ایک ایسی ذہنی فضا قائم کی جاتی ہے، جو نوآبادکار کی فکر کی صرف بالائی سطحوں سے سرسری تعارف کو کافی سمجھتی ہے۔ ہرچند یہ تعارف بھی براہ راست نہیں، بالواسطہ ہوتا ہے، مگر اسے مستند سمجھے جانے کی روش عام ہوتی ہے۔ یہ صورتِ حال اردو میں مغربی تنقید کے نصابی بیانیوں میں اپنی جامعیت کے ساتھ کارفرما ہے۔

اردو میں مغربی تنقید کے منتشر حصے ہمیں ۱۸۵۴ کے اس تعلیمی مراسلے کے بعد نظر آنے لگتے ہیں، جس میں دیسی زبانوں کے ذریعے انگریزی خیالات کی ترویج پر زور دیا گیا تھا۔ چناں چہ سکول کی سطح پر اردو نصابات کی جو کتب تیار کی گئیں ان میں مغربی تنقید کے بعض تصورات سامنے آنے لگے تھے، زیادہ تر راست اخذ و ترجمہ کی صورت۔ محکمہ تعلیم کی ان کوششوں کا ساتھ انجمنِ مطالب ِمفیدہ پنجاب (قیام ۲۱ جنوری ۱۸۶۵) نے خاص طور پر دیا۔ محمد حسین آزاد نے نئی شاعری کے سلسلے میں جو لیکچر انجمنِ پنجاب میں دیے، وہ ڈاکٹر لائٹنر اور کرنل ہالرائیڈ کے 'مغربی تنقیدی خیالات' (جنھیں ایک جامع لفظ نیچرل شاعری کا نام دیا جا سکتا ہے) پر مشتمل تھے۔ خود حالی کی مغربی تنقید کے تصورات سے آشنائی، انجمنِ پنجاب اور گورنمنٹ پنجاب بک ڈپو کی مرہون ہے جہاں وہ انگریزی سے اردو میں ترجمہ نصابی کتب کی زبان کی اصلاح کیا کرتے تھے۔ مغربی طرز کی نیچرل شاعری سے متعلق تصورات کی بھرپور حمایت علی گڑھ تحریک نے کی۔ آگے بیسویں صدی کے اوائل میں مغربی تنقید سے نصابی ضرورت کے تحت اخذ و ترجمہ کا سلسلہ جاری رہا۔ محی الدین قادری زور کی روحِ تنقید (۱۹۲۷)، حامد اللہ افسر کی نقد الادب (۱۹۳۲)، عبدالقادر سروری کی جدید شاعری (۱۹۳۲) نصابی نوعیت ہی کی کتب ہیں۔ آزادی کے بعد جب اردو میں ایم اے سطح کی تدریس کا آغاز ہوا، اور مغربی تنقید کو اس کے نصاب کا حصہ بنایا گیا تو نئی نصابی کتب کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ اس ضرورت کے تحت لکھی گئی کتابوں میں ڈاکٹر سلام سندیلوی کی ادب کا تنقیدی مطالعہ (۱۹۶۳ء)، ملک احسن اختر کی تنقیدی نظریے (۱۹۶۶ء)، سجاد باقر رضوی کی 'مغرب کے تنقیدی اصول (۱۹۶۶ء)، ڈاکٹر سیّد عبداللہ کی اشاراتِ تنقید (۱۹۶۶ء)، ڈاکٹر محمد یٰسین کی کلاسیکی مغربی تنقید (۱۹۷۵ء)، ڈاکٹر سلیم اختر کی تنقیدی دبستان (۱۹۷۴ء)، ڈاکٹر جمیل جالبی کی ارسطو سے ایلیٹ تک (۱۹۷۵ء) عابد صدیق کی مغربی تنقید افلاطون سے ایلیٹ تک (۱۹۸۳ء) اور جیلانی کامران کی مغرب کے تنقیدی نظریے (۲۰۰۰ء) قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ، کلیم الدین احمد کی اصولِ تنقید اور عملی تنقید (جو آئی اے رچرڈز کی کتابوں *Principles of Literary Criticism* اور *Practical Criticism* کی طرز پر لکھی گئیں)، ڈاکٹر شارب ردولوی کی جدید اردو تنقید — اصول و نظریات (۱۹۶۸ء) اور وزیر آغا کی تنقید اور جدید اردو تنقید (۱۹۸۹ء) بھی اہم کتب ہیں۔ یہ خالص نصابی ضرورت کے بجائے بڑی حد تک دانش ورانہ اور تحقیقی ضرورت کے تحت وجود میں آئی ہیں، تاہم انھیں

اردو میں نصابی ضرورتوں کے تحت پڑھا جاتا ہے۔آخر الذکر کتابیں فی الوقت ہماری بحث سے خارج ہیں۔

مذکورہ بالا کتب کا محرک تصنیف، اعلانیہ یا مضمر طور پر، تدریسی ہے۔(۱) عام طور یہ سمجھا جاتا ہے کہ تدریسی محرک ایک محدود محرک ہے۔ یہ مئولف کو عالمانہ کارکردگی ظاہر کرنے کا موقع نہیں دیتا۔نظریات ان کی تاریخ اور ارتقا کو پوری تحقیق اور تفصیل سے پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ یہ حقیقت حال سے زیادہ معذرت خواہی ہے، جو اس معاشرے کی طرف سے پیش کی جاتی ہے، جو تدریس کا وسیع تر مقامی و عالمی ثقافتی سطحوں پر تصور تشکیل دینے کے ارتقائی مرحلے تک نہیں پہنچا ہوتا۔ چناں چہ محدود تدریسی محرک کے تحت ایسی کتب تالیف ہوتی ہیں، جن میں نظریات کو ترجمہ،تسہیل و تلخیص،اور شرح کے ذریعے پیش کیا جاتا ہے کہ مقصود طلبا تک ان نظریات کے بنیادی مفاہیم کی ترسیل ہوتی ہے۔اپنی جگہ پر نہ یہ مقصد بُرا ہے نہ یہ طریقے معیوب ہیں۔اعتراض کا محل وہاں ہے جہاں ترجمہ ماخذ کی نشان دہی کے بغیر ہو اور تسہیل، شرح وتعبیر میں نظریات کے اصل متن سے روگردانی کی جائے۔ ان کتب میں فکر کی اوریجنلٹی کو تلاش کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے، مگر مغربی فکر کو اوریجنل انداز میں پیش کیا گیا ہے یا نہیں؟ اس امر کا جائزہ لینے میں تو کوئی حرج نہیں ہونا چاہیے۔

بغیر حوالوں کے انگریزی اقتباسات کے تراجم اپنی تحریروں میں شامل کرنے کے جس رجحان کا آغاز حالی وشبلی سے ہوا، وہ ان کتب میں بھی بعض مقامات پر موجود ہے۔ یہ کتب مغربی تنقید اور ادب کی تاریخ پر لکھی گئی ان انگریزی کتب کی مدد سے تیار کی گئی ہیں، جن کی حیثیت ثانوی مآخذ کی ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ مذکورہ بیش تر کتب کی تصنیف میں مغربی تنقید کے بنیادی متون سے بہت کم رجوع کیا گیا ہے۔ زیادہ تر جارج سنٹیس بری، جارج واٹسن، ولیم ہنری ہڈسن، رینے ویلک، ڈیوڈ ڈیشز، سکاٹ جیمز اور لائنل ٹرلنگ کی کتابوں پر انحصار کیا گیا ہے۔ان کتابوں سے صفحات کے صفحات، بغیر حوالے کے شامل کر لیے گئے ہیں۔

صرف چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

ڈاکٹر سلیم اختر

''تاریخی تنقید کا باقاعدہ آغاز فرانسیسی نقاد ایڈمنڈ شیرر سے سمجھا جاتا ہے۔اس نے ملٹن کی Paradise Lost پر والٹر اور میکالے کی تنقیدی آرا کا مطالعہ کیا تو دونوں کے فیصلوں میں قطبین کا بعد پایا۔ دہر یہ والٹر نے اس کی دل کھول کر مذمت کی تو میکالے نے اسے غیر مشروط طور پر سراہا۔ اس سے اسے تنقید میں ایسے طریقے کی جستجو ہوئی جس کے ذریعے ذاتی پسند و ناپسند سے بالا تر ہو کر ادب پاروں کا مطالعہ کیا جا سکے۔ ایسا طریقہ جس میں تخلیقات کو سمجھا تو جائے، مگر ان پر فیصلہ نہ صادر کیا جائے۔ بالفاظ دیگر یہ تنقید بھی فیصلہ اور معیار پرستی کے خلاف ایک ردّعمل ہے۔ ایسا ردّعمل، جس میں اس کے بقول:

William Henry Hudson

"...a great French Critic already named --- M. Edmond Scherer. Taking up the study of Paradise Lost, Scherer was struck by the diametrically opposed opinions of it of two such men as Voltaire and Macaulay, of whom the one indulged in unmeasured disparagement, the other is unqualified laudation.

''کسی مصنف کی صلاحیتوں کا جائزہ لیتے ہوے اس امر کا تعین بھی کرنا کہ اس نے اپنے عہد کے حالات سے متاثر ہو کر اپنی صلاحیتوں کا رُخ کس طرف موڑا۔''

ایک اور موقع پر بھی اس نے ان خیالات کا اظہار کیا:

مصنف کے کردار اور شخصیت کی تفہیم اور اس کے عصر کا تجزیہ — ان دونوں سے ہی اس کی تخلیقات کو درست طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔''

شیرر نے اس امر پر بھی زور دیا کہ کسی بھی ادب پارہ کے تنقیدی مطالعے میں سب سے پہلے تو ذاتی پسند و ناپسند اور اپنے عہد کے ادبی تعصّبات سے بلند ہو کر اس کا اس کی انفرادی حیثیت میں جائزہ لینا ہوگا۔ اس مقصد کی بطریق احسن انجام دہی کے لیے ادب پارے کا مفصل تجزیہ کرنے کے ساتھ ساتھ ادیب کی ذاتی زندگی، اس کے ماحول اور زمانے میں سیاسی، سماجی تمدنی اور ادبی عوامل کا جائزہ لیتے ہوے یہ واضح کرنا ہوگا کہ ان سب نے اس کے تخلیقی شعور پر مثبت یا منفی کس طرح اثر اندازی کی' رچرڈ مولٹن (Richard Moulten) کی مانند شیرر بھی تعین قدر اور درجہ بندی کے خلاف ہے۔ اس کے خیال میں نقاد کا یہ فریضہ نہیں کہ وہ ادب پارے کی قیمت متعین کرتا پھرے۔ نقاد کا کام تو یہ ہے کہ وہ غیر جانب داری سے تاریخی اور دیگر شخصی عوامل کی روشنی میں ادب پارے کا تجزیہ کرنے کے بعد اس کی قدر و قیمت کا فیصلہ قاری پر چھوڑ دے۔''

(تنقیدی دبستان، ص ۳۴ تا ۳۶)

... How then shall we ourselves proceed in the hope of establishing a point of view beyond personal feeling --- a point of view from which, irrespective of any question whether we ourselves enjoy or do not enjoy the poem, we may see Paradise Lost as it really is? By adopting Scherer replies, the modern historical method ... Its aim is "to account for a work from the genius of its author, and from the turn this genius has taken from the circumstances amidst which it was developed. Our first business in approaching the study of Paradise Lost, therefore, will be to eliminate as for as possible all personal bias, arising either from individual temperament and predilections or from the literary habits and tastes of our own time and circle, and to 'account for' the poem --- to explain it as it is, in all its varied characteristics of matter and style...

But here Scherer parts company with those who, like Mr. Moulten, decline to advance from interpretation to judgement. "Out of these two things," he maintains --- "the analysis of the writer's character and the study of his age-there spontaneously issues the right understanding of his work:" and this right understanding in turn furnishes us with a criterion by which to estimate its position and value."

(*An Introduction to the Study of Literature*, p. 272-73)

ڈاکٹر ملک حسن اختر

''آرنلڈ نے ادب کو تنقید حیات قرار دیا ہے۔ آرنلڈ کا یہ فقرہ جتنا مشہور ہے، اتنا ہی اسے لوگ کم سمجھتے ہیں، چناں چہ مختلف نقادوں نے اس کی مختلف تشریح کی ہے۔ پروفیسر گیرڈ (Prof. Garid) نے تنقید حیات کا مطلب یہ لیا ہے کہ کسی ادب پارے میں عضوی وحدت (Organic Unity) پائی جاے۔ ہر ادب پارہ اس طرح زندگی کے ان انتشار کی تنقید ہے۔ وہ ایڈورڈ گیرڈ (Edward Garid) کے یہ الفاظ دہراتے ہیں کہ ''ادب بالکل اس طرح زندگی کی تنقید ہے، جس طرح ایک اچھا آدمی بُرے آدمی کی تنقید ہے''، اس مفہوم کو مان لیں تو آرنلڈ کا یہ فقرہ ہمیں سڈنی کی یاد دلاتا ہے، جس کے نزدیک ایک اور سنہری دنیا ہے، جو ایک مکمل نمونہ ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے سبق آموز ہے۔''

(تنقیدی نظریے، ص۱۲۲)

سجاد باقر رضوی

''..... ایک تنقید ایسی ہوتی ہے جو فن سے پہلے وجود میں آتی ہے۔ جب ہم شاعری یا ادب کو تنقید حیات کہتے ہیں تو ہماری مراد اس تنقید سے ہوتی ہے۔ پس ہم کَہ سکتے ہیں کہ اس تنقید میں جو فن سے پہلے پیدا ہوتی ہے اور اس میں جو فن کے بعد ہوتی ہے اور دوسری اس تنقید کی تنقید۔ فن پارے کے وجود کے لیے زندگی پر تنقید ضروری ہے۔''

(مغرب کے تنقیدی اصول، ص۳)

لائنل ٹرلنگ

"...many interpretations of it have been offered by poets and critics. Professor Garrod, for example, interprets it to mean merely that insofar as a work possesses organic unity it is a criticism of the chaos of life; he quotes Edward Caird who said that "literature is a criticism of life exactly in the sense that a good man is a criticism of a bad one." This would bring Arnold's phrase close to Sir Philip Sidney's "golden world" of art which is a model and corrective for the "brazen world;"..."

(*Mathew Arnold*, p. 194)

سکاٹ جیمز

"There is a kind of criticism which exists before art itself, and is presupposed in all art, just as there is a kind of criticism which follows art, taking art as its subject-matter. The distinction is that between the criticism of life, which comes first,and the criticism of the criticism, which comes second in order of thought, though perhaps almost simultaneously in order of time. You cannot criticize a work of art until the work of art exists."

(*The Making of Literature*, p. 16)

''اسی طرح کا فرق نظم اور لغت میں ہوتا ہے۔ ایک میں ہمیں حسن ملتا ہے، جو مسرت بخش ہوتا ہے اور دوسری محض غلط یا صحیح ہوتی ہے ..... ڈی کوئنسی ان دو اقسام کی تحریروں میں فرق کرتا ہے..... ایک معلوماتی ادب اور دوسرا مؤثر ادب ..... معلوماتی اور تخیلاتی دونوں اقسام کے ادب صداقت کی تلاش کرتے ہیں، مگر ان کے راستے مختلف ہوتے ہیں۔ ایک کا راستہ عقلی، دوسرے کا وجدانی ہوتا ہے۔''

(مغرب کے تنقیدی اصول، ص ۸ تا ۹)

"At one extreme we may have a poem, whose excellence lies in its beauty, at the other a dictionary, which is merely accurate or inaccurate... The main distinction is that laid down by De Quincy between the "literature of knowledge" and the "literature of power"... Both kinds of literature may be concerned with truth, but they arrive at it in different ways --- the first by a judgement about it, the second by intuition."

(*The Making of Literature*, p. 22-4)

نظریات کی وضاحت اور تاریخ پیش کرنے کی غرض سے ثانوی مآخذ پر انحصار کوئی قابل رشک بات نہیں ہے، مگر جب ان ثانوی مآخذ کے مواد کو بھی اپنا مواد بنا کر پیش کرنے کی روش اختیار کر لی جائے تو صورتِ حال کافی گھمبیر ہو جاتی ہے۔ مصنّفین کی علمی اور اخلاقی ثقاہت دونوں معرضِ سوال میں آ جاتی ہیں۔ ''ترجمہ نگاری'' کی اس روش کا اہم پہلو یہ ہے کہ ترجمہ شدہ عبارت کی درست اور مکمل تفہیم نہیں ہوتی۔ اصل انگریزی عبارت میں بحث کا سیاق و سباق ہوتا ہے، ''ترجمے'' میں یہ شامل نہیں ہوتا، چناں چہ قاری کو جھٹکا لگتا ہے۔ مثلاً ملک احسن اختر نے مندرجہ بالا اقتباس ٹرلنگ کی کتاب کے اس حصے سے لیا ہے، جہاں وہ بحث اٹھاتے ہیں کہ آرنلڈ کے قول ''ادب (شاعری) تنقید حیات ہے''، کو کوئی حقیقی شاعر، خواہ اس کے کچھ فلسفیانہ اور سیاسی مقاصد ہوں، شاعری کی جامع تعریف قرار نہیں دے سکتا۔ وہ اس بحث کو آگے بڑھانے کے لیے دو پروفیسروں (جن کے ناموں کو ملک احسن اختر نے غلط درج کیا ہے) کی تشریحات کا حوالہ دیتا ہے۔ اور بعد ازاں آرنلڈ کے اس قول سے متعلق اپنی رائے پیش کرتا ہے۔ یہ رائے دراصل آرنلڈ کی مجموعی تنقیدی فکر کے تناظر میں ہے۔

"He is stating the function of poetry, at least what he considers to be its chief function. Criticism is not what poetry is; it is what poetry does. How it does it is another matter."

(Mathew Arnold, p. 196*)*

لطف کی بات یہ ہے کہ ڈاکٹر ملک احسن اختر بھی آرنلڈ کے اس قول سے متعلق اپنی رائے پیش کرتے ہیں۔ یہ ''رائے'' لائنل ٹرلنگ کی وضاحت اور ملک صاحب کی اپنی فکر رسا کا ایک ایسا ملغوبہ ہے، جو داد سے بالا تر ہے۔

بہر حال آرنلڈ کا مطلب اس فقرے سے ہمارے خیال میں یہی ہے کہ ادیب زندگی کی تنقید اچھے اور بُرے میں تمیز پیدا کر کے کرتا ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ آرنلڈ یہاں ادب کی ماہیت پر روشنی نہیں ڈال رہا، بلکہ وہ ادب کے مقصد کو واضح کر رہا ہے۔ یعنی بتاتا ہے کہ ہم کو کس طرح زندگی گزارنی چاہیے یہ سوال اخلاقیات سے تعلق رکھتا ہے، یعنی نقاد کی طرح ادیب بھی مصلح کے فرائض سرانجام دیتا ہے۔

(تنقیدی نظریے، ص ۱۲۲-۱۲۳)

اردو تنقید نے آرنلڈ کے اس قول سے کیا کیا مطالب وابستہ کیے ہیں، یہ بحث تو آگے آ رہی ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا ہے کہ آرنلڈ کے نزدیک تنقید ''اچھے اور بُرے میں تمیز'' کے اخلاقی تصور سے کہیں آگے کی چیز ہے۔

نظریات کی تسہیل و تلخیص، بلاشبہ بنیادی نصابی ضرورت ہے۔ اسے ان کتب میں بہ طور خاص مدّنظر رکھا گیا ہے۔ زیرِ مطالعہ کتب میں مغربی تنقیدی نظریات کی تسہیل و تلخیص کی دل چسپ روداد سامنے آتی ہے۔ کلاسیکی مغربی نظریات کی تسہیل اور تلخیص کرتے ہوئے اردو نقاد بالعموم کسی دِقّت کا شکار نہیں ہوئے مگر جہاں جدید مغربی تنقیدی نظریات کی تسہیل کا مرحلہ آیا ہے، وہاں اکثر نقادوں کا سانس اکھڑتا محسوس ہوا ہے۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ کلاسیکی مغربی تنقید کی پس منظری فکر یونانی ہے، جس سے اردو ذہن اپنے عربی پس منظر کی وجہ سے بالعموم مانوس ہے، جب کہ جدید تنقید نہ صرف اُن علمیاتی اصولوں کو توڑتی ہے، جن کے تحت کلاسکی تنقید ظہور پذیر ہوتی ہے، جدید تنقید، ان کی جگہ نئے علمیاتی اصول بروئے کار لاتی ہے،—— بلکہ جدید تنقید متعدد اور تغیر پذیر تناظرات کی علم بردار بھی ہے۔ جدید تنقید کے علمیاتی اصولوں اور تناظر کو ملحوظ رکھے بغیر، اس کے نظری مباحث کی تفہیم ہی ممکن نہیں، تسہیل تو تفہیم کے بعد کا مرحلہ ہے، زیرِ مطالعہ کتب میں عموماً جہاں نظری مباحث کو سادہ و سلیس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، وہاں (مذکورہ وجوہ سے) تسہیل کی جگہ اُلجھنیں اور بوالعجبیاں دکھائی دیتی ہیں۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ نے اشاراتِ تنقید میں ''تنقید کیا ہے؟'' کی بحث، تنقید کی چند مغربی تعریفات (جو انگریزی لغات، برطانوی و امریکی انسائیکلوپیڈیا، ایڈمنڈ گوس، آئی اے رچرڈز، ٹی۔ایس۔ ایلیٹ، رچرڈ مولٹن سے ماخوذ ہیں) کی بنیاد پر اٹھائی ہے۔ وہ ان تعریفات کی سہل اسلوب میں تشریح کرتے ہیں۔ یہ تشریح بڑی حد تک ہڈسن کی کتاب سے ماخوذ ہے، مگر حوالہ موجود نہیں۔ سیّد صاحب نے حوالہ مولٹن کی کتاب *Shakespeare as a Dramatic Artist* کا دیا ہے، مگر یہ حوالہ بھی ہڈسن کی کتاب سے لیا گیا ہے۔ اس کی شہادت اس بات سے ملتی ہے کہ سیّد صاحب نے وہی باتیں درج کی ہیں، جو ہڈسن کے یہاں موجود ہیں۔ ہڈسن نے مولٹن کے حوالے سے سائنسی اور تشریحی تنقید کے امتیاز پر لکھا ہے۔ سیّد صاحب بھی اس امتیاز کو اجاگر کرتے ہیں:

> مولٹن نے تنقیدی فیصلوں کی موجودگی کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ کہا ہے کہ تنقید کا عمل جو کچھ بھی ہے، اس کے دو طریقے قدیم زمانے سے مروّج ہیں۔ ایک تو سائنسی طریقہ، یعنی ادب پارے کا مطالعہ کرکے اس کے مطالب کو دوبارہ اچھی طرح پیش کرنے اور مصنّفین وغیرہ کے بارے میں تحقیق و جستجو (Investigation) کا طریقہ۔ دوسرا عقلی طور پر، پرکھ تول کر، فیصلہ صادر کرنے (Judgement) کا طریقہ۔''
>
> (اشاراتِ تنقید، ص ۷، ۸)

اس اقتباس میں درج دونوں باتیں، اپنے اصل انگریزی ماخذ کے اعتبار سے اور اصولی طور پر درست نہیں ہیں۔ اوّل یہ کہ سائنسی اور ''پرکھ تول کر فیصلہ کرنے'' کے دونوں طریقے قدیم سے نہیں ہیں۔ سائنسی طریقہ نیا ہے اور تشریحی انداز نقد نسبتاً پرانا ہے، نیز سیّد صاحب دونوں طریقوں کا جو مفہوم بغرض تسہیل و تلخیص پیش کیا ہے، وہ ان کی اپنی اختراع ہے، ذرا ہڈسن کی وضاحت ملاحظہ کیجیے:

> ...inductive criticism will examine literature in the spirit of pure

investigation; looking for law of art in the practice of artist, and treating art like the rest of nature.

اور

Judicial criticism proceeds upon the hypothesis that there are fixed standards' by which literature my be tried and adjudged.

(*An Introduction to the Study of Literature*, p. 270-71)

اپنی کتاب کے اگلے صفحے پر سیّد صاحب نے سائنسی تنقید کی مزید صراحت کی ہے:

> تنقید کو سائنس یا سائنسی عمل کے تابع ایک شعبہ، کہنے والے دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ تنقید، سوا اس کے کچھ نہیں کہ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، اس کو ایک خاص ترتیب سے یا تلخیص سے بلا کم و کاست، اپنی رائے یا ترجیحی سلوک کے بغیر دوبارہ بیان کر دیا جائے، مگر یہ طریق کار کسی خاص علم وفضل کا یا ناقدانہ بصیرت کا یا ادب فہمی کا طلب گار نہیں۔ اخبار کا ہر ذی فہم قاری یا کوئی شوقین کتاب خواں، جسے کتابوں کے نوٹ رکھنے کی عادت ہو، یہ کامیابی سے کر سکتا ہے۔
>
> (اشاراتِ تنقید، ص ۹)

نظریات کی تسہیل (اور تلخیص) کا بنیادی قاعدہ یہ ہے کہ نظریات کے جوہر اصلی کو قائم رکھتے ہوئے انھیں روزمرہ کی مانوس زبان میں اختصار سے پیش کیا جائے۔ نظریات کی تکنیکی اور اصطلاحاتی زبان، انھیں دقیق اور نامانوس بناتی ہے۔ روزمرہ کی زبان میں انھیں پیش کرنے سے گویا اصطلاحات اور دلائل کی پیچیدگی کو نظریے سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے کہ اس عمل سے نظریے کی صحت کتنی متاثر ہوتی ہے؟ اگر یہ سمجھا جائے کہ اصطلاحات اور پیچیدہ دلائل کے بغیر بھی کوئی نظریہ اپنی اصل کو قائم رکھنے میں کامیاب ہوتا ہے تو اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ اصطلاحات اور دلائل نظریے کا فاضل مواد یا اس کا آرائشی عنصر ہیں جنھیں الگ کر دینے کے باوجود نظریے کی اصل برقرار رہتی ہے، اصل یہ ہے کہ تسہیل کے نتیجے میں نظریے کی ساری سطحوں کو ان کی اصل شکل میں برقرار رکھنا محال ہوتا ہے۔ سیّد صاحب نے مندرجہ بالا اقتباسات میں سائنسی اور تشریحی اندازِ نقد کی جو تسہیل پیش کی ہے، اس میں زبان تو یقیناً مانوس ہے اور اصطلاحات سے مبرّا اور روزمرہ کے قریب ہے، مگر نظریات کا اصل جوہر قائم نہیں رہ سکا۔ سیّد صاحب کی تشریحات اصل متن سے مطابقت ظاہر کرنے سے قاصر ہیں۔ پروفیسر رچرڈ مولٹن کا سائنسی تنقید کا نظریہ ہرگز یہ مفہوم نہیں رکھتا کہ کسی متن کو ''خاص ترتیب سے یا تلخیص سے بلا کم و کاست'' بیان کر دیا جائے۔ یہ انداز شرح وتشریح کا ہے، جب کہ سائنسی تنقید ادبی متن کا مطالعہ اسی طرح کرتی ہے، جس طرح ایک سائنس دان فطرت کے کسی مظہر کا مطالعہ کرتا ہے۔ دونوں اپنے معروض میں مضمر اصولوں کی تلاش کرتے ہیں۔ انھیں صرف اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ فطرت کے کسی مظہر یا ادبی متن کو کن عناصر نے کن اصولوں کے ربط باہم سے مخصوص شکل دی ہے؟ انھیں اپنے معروض کی اخلاقی یا افادی قدر سے بحث نہیں ہوتی اور ظاہر ہے اس کے لیے اچھے خاصے علم وفضل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اخبار کا ایک ذی فہم قاری اگر غالب کی غزل کے تشکیلی اصولوں کو مرتب کرنے

کا اہل ہوتا تو یہ ادبی تنقید کا معجزہ ہوتا۔ یہاں یہ اعتراف کیا جانا چاہیے کہ اپنے دوسرے عیوب سے قطع نظر، سجاد باقر رضوی کی مغرب کے تنقیدی اصول تسہیل و تلخیص میں کام یاب ہے۔ یہ اصل انگریزی متن سے بالعموم روگردانی نہیں کرتی۔ (۲)

زیرِ مطالعہ کتب کے مؤلفین نے مغربی نظریات کی شرح اور تعبیر میں خوب سرگرمی اور آزادی کا مظاہرہ کیا ہے۔ تقریباً تمام کتب (۳) میں بغیر حوالوں اور حواشی کے نظریات کی توضیح اور تعبیر کی گئی ہے۔ نظریات کے اصل متن کو پیش کرنے کا کہیں اہتمام ہے نہ کسی مغربی نقاد کے نظریات کے ارتقا اور تناظر کو مجملاً ہی سہی، پیش کرنے کی ضرورت ہی محسوس کی گئی ہے۔ اس صورت میں مؤلف ان تمام پابندیوں سے آزاد ہو جاتا ہے جو نظریات کو ان کے تناظر میں پیش کرنے کی صورت میں عائد ہوتی ہیں۔ اس آزادی کے نتیجے میں مؤلف نظریات کی شرح اور تعبیر من مانے انداز میں کرتا ہے۔

یہاں تمام مغربی نظریات کی شرح اور تعبیر کا جائزہ لینے کی گنجائش نہیں۔ صرف آرنلڈ کے نظریے ''شاعری تنقید حیات ہے''، کی تعبیر کو بہ طور مثال پیش کیا جاتا ہے۔ یہ ایک مثال اس عمومی ذہنی فریم ورک کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے، جو دوسرے مغربی تنقیدی نظریات کی تعبیر میں کارفرما رہا ہے۔ آرنلڈ کے نظریے کو منتخب کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس نے اردو تنقید کو دیگر مغربی نظریات کے مقابلے میں زیادہ متاثر کیا ہے۔ اردو کی مارکسی اور غیر مارکسی دونوں طرح کی تنقید آرنلڈ کے اس نظریے کو عزیز رکھتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اِسے زیرِ مطالعہ کتب میں کس مفہوم میں لیا گیا ہے؟

اردو تنقید میں آرنلڈ کے نظریے کی بازگشت بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں سنائی دینے لگی تھی۔ نیاز فتح پوری، حامد اللہ افسر کی تحریروں میں آرنلڈ کا ذکر آنے لگا تھا۔ تاہم عبدالقادر سروری پہلے اردو نقاد ہیں جن کی کتاب جدید اردو شاعری (۱۹۳۲) میں اس نظریے کی شرح پیش کی گئی تھی۔ یہ کتاب بھی اصلاً طلبا کی درسی ضرورت کی خاطر تصنیف ہوئی تھی۔

> میتھیو آرنلڈ کے بعد شاعری کو ''تنقید حیات'' یا حیات کی ترجمانی سمجھنے کا دستور عام ہو گیا ہے۔ شاعری حقیقت میں حیات کی تفسیر ہے اور تفسیر اس خاص نوعیت سے، جس طرح حیات کا نقش شاعر کے دل پر مرتسم ہوتا ہے، اس ترجمانی یا تفسیر میں شعریت، اس وقت پیدا ہوتی ہے، جب اس میں تخیل اور جذبات دونوں موجود ہیں۔
>
> (جدید اردو شاعری، ص۱۴)

میتھیو آرنلڈ کا یہ مدعا ہرگز نہیں تھا جو عبدالقادر سروری نے بیان کیا ہے۔ ''تنقید حیات'' کو حیات کی ترجمانی اور حیات کی تفسیر کہنا، من مانی تفسیر ہے، جو تنقید کے لغوی اور عمومی مفہوم کو پیش نظر رکھ کر کی گئی ہے۔ ہڈسن کے اثرات کے تحت اردو تنقید میں یہ خیال عام ہوا کہ ادب زندگی کی ترجمانی اور تفسیر ہے اور تنقید، ادب کی ترجمانی اور تفسیر ہے۔ لہٰذا شاعری کا تنقید حیات کا مطلب، حیات کی ترجمانی و تفسیر ہے۔ ظاہر ہے یہ مفہوم آرنلڈ کے نظریے کے اصل تناظر کو پس پشت ڈالنے کے نتیجے میں قائم کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سیّد عبداللہ آرنلڈ کے اس نظریے کی شرح میں رقم طراز ہیں:

> آرنلڈ نے نقاد کے فرائض کی جو فہرست پیش کی ہے، اس میں ایک ہدایت یہ ہے کہ وہ مخلصانہ انداز میں ادب پارے کو غور سے پڑھے اور اس سے اچھی طرح باخبر ہو کر اس کے معارف و معانی کو دوسروں تک پہنچائے اور سعی کرے کہ بہترین افکار دنیا میں پھیل جائیں۔ ایک دوسرا فرض یہ ہے کہ ایسی فضا تیار ہو جس میں مستقبل کا اعلیٰ ادب

پرورش پا سکے۔

(اشاراتِ تنقید،ص ۱۰۱)

آرنلڈ کا وہ جملہ ملاحظہ فرمایئے، جس کی تعبیر سیّد صاحب نے کی ہے۔

> Literary Criticism is a disinterested endeavour to learn and propagate the best that is known and thought in the world, and thus to establish a current of fresh and true idea.
>
> *(Essay in Criticism 1st Series,* p. 37*)*

سیّد صاحب نے disinterested endeavour کو مخلصانہ انداز کہا ہے۔لفظی مفہوم تو کسی حد تک درست ہے مگر آرنلڈ تنقید کو ''کسی ادب پارے کا مخلصانہ انداز میں مطالعہ'' نہیں قرار دیتا۔سجاد باقر رضوی نے آرنلڈ کے موقف کی درست نشان دہی کی ہے کہ اُس نے ''تنقید کو پوری زندگی کی تنقید کے عظیم تر منصب پر فائز کیا۔'' (مغرب کے تنقیدی اصول،ص۲۶۳) آرنلڈ نے تنقید کو اس کے لغوی مفہوم (کھرے کھوٹے میں امتیاز) اور محدود اصطلاحی مفہوم (تشریح وتعین قدر) سے آزاد کیا اور اسے زندگی اور کلچر کی ایک ارفع سرگرمی قرار دیا۔آرنلڈ جب شاعری کو تنقید حیات قرار دیتا ہے تو اس کے پیش نظر تنقید کا وسیع کلچرل مفہوم پیش نظر ہوتا ہے۔گویا آرنلڈ کے اس نظریے کا داخلی تناظر ہے، جسے آرنلڈ کے مجموعی تنقیدی نظام کو ملحوظ رکھے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ جیلانی کامران کے یہاں آرنلڈ کے مذکورہ نظریے کی ''مثالی مکتبی تعبیر'' ملتی ہے، یعنی ایک ہی بات کو گھما پھرا کر تکرار کے ساتھ کہنا۔

> آرنلڈ کی اصطلاح میں تنقید حیات سے زندگی کے حالات اور واقعات پر تصورات کا اطلاق مراد ہے۔انگریزی میں اس عمل کو Application of Ideas to life کہا گیا ہے یعنی زندگی کو تصورات کی روشنی میں کیسے سمجھا گیا ہے۔تنقید حیات سے زندگی کو فکری اعتبار سے سمجھنا مراد ہے۔حالات اور واقعات کی تشریح کرنے کو تنقید حیات کہا جا تا ہے۔تشریح (Interpretation) کے طریق کار سے جو نتائج دستیاب ہو سکتے ہیں یہ ہیں کہ زندگی کیا ہے؟ حالات و واقعات کی صورت ایسی کیوں ہے اور کیسے ہے؟ لیکن تنقید حیات سے شاعری کے وہ بہتر خصائص بھی آشکار ہو سکتے ہیں جن کے ساتھ دل جوئی اور دست گیری کی توقعات وابستہ ہیں۔
>
> (مغرب کے تنقیدی نظریے ،جلد دوم،ص ۱۱۰-۱۰۹)

اس اقتباس پر تبصرے کے بجائے یہ مناسب ہے کہ آرنلڈ کے نظریے کو اس کے حقیقی تناظر میں پیش کر دیا جائے۔

آرنلڈ نے پہلے (۱۸۶۴) تمام ادب کو اور بعد ازاں (۱۸۷۹) صرف شاعری کو تنقید حیات کہا تھا، اپنے تنقیدی مقالات کی دوسری جلد میں اس نے یہ قصہ دہرایا ہے۔

> I have seen it said that I allege poetry to have for its characteristic this: that it is a criticism of life; and that I make it to be thereby distinguished

from prose, which is something else. So far from it, that when I first used this expression, a criticism of life, now many years ago, it was to literature in general that I applied it, and not to poetry in special. 'The end and aim of all literature', I said, 'is, if one considers it attentively, nothing but that; a criticism of life.' And so it surely is; the main end and aim of all our utterance, whether in prose or in verse, is surely a criticism of life. We are not brought much on our way, I admit, towards an adequate definition of poetry as distinguished from prose by that truth; still a truth it is, and poetry can never prosper if it is forgotten. In poetry, however, the criticism of life has to be made conformably to the laws of poetic truth and poetic beauty.

(Essays in Criticism, Second Series, p. 186-7*)*

شاعری، شاعرانہ جمالیات اور شاعرانہ صداقت کے قوانین سے ہم آہنگ ہوتے ہوئے زندگی کی تنقید کیوں کر ہوسکتی ہے؟ یہ وہ بنیادی سوال ہے، جسے معرضِ بحث میں نہیں لایا گیا، مگر یہی وہ سوال ہے جو آرنلڈ کے نقطۂ نظر کی درست تفہیم کے لیے کلید کا درجہ رکھتا ہے۔ شاعرانہ جمالیات اور صداقت، شاعری کے روایتی عناصر ہیں: ان کے بغیر شاعرانہ متن وجود پذیر نہیں ہوتا۔ (آرنلڈ کی فکر کا بڑا حصہ یوں بھی روایتی ہے)۔ آرنلڈ شاعری کے روایتی عناصر میں نیا عنصر یعنی تنقید حیات، اس شرط پر شامل کرتا ہے کہ وہ روایتی عناصر سے ہم آہنگ ہو، یا انھی عناصر کے حدود میں رہتے ہوئے تنقید حیات کا عمل کیا جائے۔ اگلا سوال یہ ہے کہ 'وہ تنقید' کا لفظ کس مفہوم میں برت رہا ہے؟ کیا وہ اس سے وہ طریق کار مراد لے رہا ہے، جو ادبی متن کے تنقیدی مطالعے میں برتا جاتا ہے کہ شاعری اس طرح زندگی (کے متن) کا مطالعہ کرتی ہے، جس طرح تنقید شاعری (کے متن) کا مطالعہ کرتی ہے؟ عیوب و محاسن کی تلاش، تعبیر، تجزیہ اور تعین قدر؟ اردو تنقید میں تو بالعموم یہی کچھ سمجھا گیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ آرنلڈ نے 'تنقید حیات' کا تصور فرانسیسی اور جرمن فکر سے لیا گیا ہے۔ آرنلڈ پر ساں بیو کے گہرے اثرات ہیں۔ جارج واٹسن نے لکھا ہے کہ آرنلڈ نے تنقید حیات کی ترکیب ساں بیو کی استعمال کردہ اصطلاح Philistine سے اخذ کی ہے، جو جرمن لفظ Philister سے ماخوذ ہے (*Literary Critics*, P 153) آرنلڈ اس کا ترجمہ disinterested endeavour کرتا ہے۔ یعنی تنقید ایک ایسی بے غرض سعی ہے، جو اشیا کی اصل تک پہنچنے کی خواہش کرتی ہے۔ وہ اشیا کو ان کی افادی قدر کے زاویے سے جانچنے کی بجائے، ان کی حقیقی اور نفسی قدر کے حوالے سے پہچانتی ہے اور اس طرح بہترین خیالات جمع کرتی ہے۔

… real criticism obeys an instinct prompting it to try to know the best that is known and thought in the world, irrespectively of practice, politics, and everything of the kind; and to value knowledge and thought as they approach this best, without the intrusion of any other considerations whatever.

(Pages from the Prose writings of Mathew Arnold, p. 9)

مگر تنقید محض خیالات جمع نہیں کرتی، انھیں معاشرتی زندگی میں کچھ اس طور پھیلاتی بھی ہے کہ معاشرتی زندگی ایک نئے نظام خیال کی علم بردار ہو جاتی ہے۔ شاعری اس نظام خیال کی تجسیم کرتی ہے۔ آرنلڈ نے یہ مؤقف پیش کیا کہ شاعری خیالات تخلیق نہیں کرتی، موجود 'خیالات کے نظام' کو بروئے کار لاتی ہے۔ آرنلڈ کے یہاں خیالات کے سلسلے میں ایک درجہ بندی موجود ہے۔ فلسفہ خیالات کو جنم دیتا ہے، تنقید بہترین خیالات کو جمع کرتی اور ان کی اشاعت کرتی ہے، شاعری انھیں بروئے کار لاتی ہے، لہٰذا تنقید فلسفے کی طفیلی، اور شاعری تنقید کی طفیلی بن جاتی ہے۔ بنابریں آرنلڈ کا شاعری کو تنقید حیات کہنے کا مطلب نہ تو ''زندگی کو فکری اعتبار سے سمجھنا ہے'' نہ ''مخلصانہ انداز میں ادب پارے کو غور سے پڑھنا ہے'' بلکہ شاعری کا اس 'نظام خیال' پر بنیاد رکھنا ہے، جسے تنقید نے پیدا کیا ہے۔

> تنقید کا کام یہ ہے —— اور یہ بنیادی کام ہے —— کہ وہ اپنے دور کے نئے نظامِ خیال کی تشکیل نو کرے —— ہر دور میں مختلف تاریخی دھاروں کے بہاؤ کی وجہ سے جو فکری، سماجی، معاشی اور تاریخی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور جن کی وجہ سے کلچر بدلتا رہتا ہے اور پرانا نظام خیال کمزور ہوتا اور ٹوٹتا پھوٹتا رہتا ہے۔ تنقید کا کام یہ ہے کہ وہ اس نظام خیال کو نئے سرے سے مرتب کرتی رہے تاکہ ایک طرف تغیر میں تسلسل باقی رہے اور دوسری طرف زندگی کے ہر شعبے میں تخلیق کا عمل جاری رہے۔
>
> (ارسطو سے ایلیٹ تک، پیش لفظ)

ڈاکٹر جمیل جالبی تنقید کو آرنلڈ کی تقلید میں ایک 'ثقافتی عمل' قرار دیتے ہیں، جس کے نتیجے میں نیا نظام خیال پیدا ہوتا اور تخلیقی قوت کی بنیاد بنتا ہے، انھوں نے مغربی تنقید کے اہم نظریات کی تلخیص و شرح کے بجائے ان کے تراجم پیش کیے ہیں تاکہ نظریات کے اصل مطالب کو فی نفسہٖ سمجھا جا سکے اور نئی ذہنی فضا تشکیل پا سکے۔ دوسری طرف انھوں نے اپنی جملہ تنقیدی تحریروں میں آرنلڈ کے امتزاجی تنقیدی موقف کو پیش کیا ہے۔

آرنلڈ نے یہ نظریہ اصلاً ایک نعرے کے طور پر دیا تھا اور اس برطانوی معاشرے کو دیا تھا جو صنعتی کلچر کی وجہ سے افادیت پسندی کے جنون میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آرنلڈ اس صورتِ حال کو انسانی عظمت و کمال کے منافی خیال کرتا تھا۔ آرنلڈ عظمت و کمال کا روحانی تصور رکھتا تھا، یہ تصور اپنی اصل میں قدیمی، مگر اپنے عمل میں جدید تھا۔ روایتی طور پر یہ سوال اٹھایا جا سکتا ہے کہ جس معاشرے نے ابھی مادی ترقی کا سفر شروع کیا ہو نہ اس کے نتیجے میں افادیت پسندی کے جنون میں مبتلا ہوا ہو، اس معاشرے میں آرنلڈ کے نظریے کی کیا معنویت ہو گی؟ مگر ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرز کے روایتی سوالات (جو اکثر ترقی پسند ناقدین کی طرف سے اٹھائے جاتے ہیں) ایک قسم کے خوف زدہ ذہنیت کی پیداوار ہوتے ہیں؛ بعض لوگ ڈرتے ہیں کہ 'فوری سماجی ضرورت سے غیر ہم آہنگ نظریہ' کہیں اس عمل میں خلل انداز نہ ہو جسے سماجی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں شروع کیا گیا ہوتا ہے۔ انھیں جس قدر اپنے نظریے کی صداقت پر یقین ہوتا ہے، اسی قدر دوسرے اور مختلف نظریات کی قوت کے سلسلے میں خوف بھی ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ کسی ایک سماج میں، اس سماج کے سوالات کے جوابات کے طور پر تخلیق ہونے والے نظریات کو اپنے سماج میں معرض بحث میں لانے کے چند در چند اسباب ہوتے ہیں۔ (۱) انھیں آفاقی سمجھا جاتا ہے، اس لیے جتنے وہ اپنے سماجی تناظر میں

موزوں ہوتے ہیں، اتنے ہی وہ دوسرے سماج میں موزوں سمجھے جاتے ہیں۔ **(ب)** انھیں 'مقامی' سمجھا جاتا ہے، مگر ان کی تعبیر نو کر کے اپنی صورتِ حال سے ہم آہنگ کر لیا جاتا ہے۔ **(ج)** محض ذہنی جستجو اور علم میں اضافے کی خاطر انھیں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پہلی دونوں صورتیں کم یا زیادہ نوآبادیاتی صورتِ حال کی پیدا کردہ ہوتی ہیں، جب کہ آخری صورت اس وقت ممکن ہوتی ہے، جب آدمی اپنے اندر علم کے لیے بے ریا تڑپ پیدا کرنے میں کام یاب ہو جاتا ہے۔ وہ نظریات کو فی نفسہٖ اہمیت دیتا اور انھیں ایک خالص انسانی سرگرمی سمجھتا ہے؛ وہ انسان کا تصور ایک سماجی حیوان کے طور پر نہیں ایک تجسس پسند روح کے طور پر کرتا ہے جسے ہر اس فکر، خیال، نظریے، تجربے سے دل چسپی ہوتی ہے جسے کہیں بھی اور کسی بھی زمانے میں کسی انسان یا سماج نے جنم دیا ہوتا ہے؛ وہ زندگی کو فوری ضرورتوں پر ردِّعمل ظاہر کرنے والی ایک جبلی ہستی نہیں سمجھتا؛ گہری، وسیع، زمانی، لازمانی انسانی احتیاجات پر تدبر کرنے والی حوصلہ پسند ہستی خیال کرتا ہے۔ بلاشبہ اس کے لیے ایک قسم کی ذہنی علیحدگی کی ضرورت ہوتی ہے! اس ذہنی علیحدگی کی وجہ سے نظریات کو ان کے اپنے تناظر، ان کی تاریخ اور دیگر نظریات کے مقابلے میں رکھ کر دیکھا جاتا ہے۔ اسی سے حقیقی دانش ورانہ رویہ جنم لیتا ہے۔

اس بحث کی روشنی میں دیکھا جائے تو نصابی نوعیت کی کتب میں مغربی تنقیدی نظریات اور دبستانوں کو بیش تر آفاقی سمجھ کر پیش کیا گیا ہے۔ نتیجتاً ان نظریات کو نہ تو ان کے ثقافتی اور علمیاتی تناظر میں رکھ کر سمجھا گیا ہے اور نہ ان نظریات کے باہمی تناقضات کو منظرِ عام پر لایا گیا ہے۔ ان کے مطالعے سے مغربی تنقید کے بارے میں منتشر، اور اکثر ناقص معلومات تو ملتی ہیں، مگر بصیرت نہیں ملتی۔ تسلیم کہ متعدد مغربی نقادوں اور اُن کے معروف اقوال اور خیالات کا علم حاصل ہوتا ہے، مگر ان نقادوں کے ذہنی فریم ورک اور ان کے خیالات کی چھوٹی بڑی پرتوں اور ان پرتوں کو تشکیل دینے والے عوامل سے آگاہی نہیں ملتی۔ ان کتب کی تصنیف کے ''بنیادی راہ نما اصول'' مغربی تنقید کی اصل اور روح تک پہنچنے کا امکان نہیں رکھتے۔ تاہم بعض لوگوں نے مغربی نظریات کے اردو ادب پر انطباق کے حدود کی طرف توجہ ضرور دلائی ہے۔ سجاد باقر رضوی لکھتے ہیں:

> ..... یہ تمام اصول و نظریات من و عن اردو ادب پر منطبق نہیں کرنے چاہییں۔ ان ادبی کاوشوں پر تو ان کا انطباق بہ آسانی ہو سکتا ہے جو مغرب کی تحریک پر ہی ہمارے یہاں پیدا ہوئیں، بالخصوص ان میں جہاں مغربی طرز فکر بھی نمایاں ہو، مگر ہمارا وہ ادب جو خالصتاً ہمارا ہے، اور مغربی اثرات کے باوجود جس حد تک نئی تحریکات کے ساتھ قدیم روایت کی شمولیت ہے، اس کے متعلق ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا ہوگا۔
>
> (مغرب کے تنقیدی اصول، ص ج)

گویا سجاد باقر رضوی اس مؤقف کے حامی ہیں کہ تنقیدی اصول اپنی ماہیت میں ''داخلی'' ہوتے ہیں۔ وہ تخلیق کے داخل سے برآمد ہوتے یا کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا تخلیق کے داخلی نظام یا شعریات کی تبدیلی سے تنقیدی اصول بھی بدل جاتے ہیں، مگر سوال یہ ہے کہ کیا تمام تنقیدی نظریات ''داخلی'' ہوتے ہیں، ''خارجی'' نہیں ہوتے؟ ارسطو کے نظریات ''داخلی'' قرار دیے جا سکتے ہیں، مگر نفسیاتی تنقید، مارکسی تنقید، تاریخی، عمرانی تنقید، ساختیاتی تنقید کے بارے میں کیا رائے ہے؟ یہ تمام ''خارجی'' ہیں، انھیں دیگر علوم سے اخذ کیا گیا ہے، ان کے انطباق کی کیا صورت ہوگی؟ ان سوالات پر گہرا تامل ان کتابوں میں کہیں نہیں ملتا۔ اصل یہ ہے کہ ہر تنقیدی اصول

اور نظریے کی علمیات اور تناظر دونوں سے آگاہی ضروری ہوتی ہے۔ اس کے بعد ہی اس کے انطباق کے حدود اور امکانات کا تعین کیا جا سکتا ہے۔

کسی نظریے کی تعبیر پیچیدہ عمل ہے۔ تعبیر کسی نہ کسی اصول، تناظر یا مؤقف کی روشنی میں ہوتی ہے۔ تعبیر کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو اصول، تناظر اور مؤقف کو اوّلیت دی جاتی اور نظریے کو ان سے ہم آہنگ بنایا جاتا ہے۔ یا پھر اوّلیت نظریے کو دی جاتی اور اصول، تناظر یا مؤقف کو اس کے تابع رکھا جاتا ہے، اس کی توسیع کی جاتی ہے۔ مغربی تنقید کی اردو میں نصابی کتب میں اس سوال پر بالعموم غور نہیں کیا گیا کہ مغربی نظریات کی تعبیر میں اوّلیت کس کو دی جا رہی ہے اور کس کو دی جانی چاہیے؟ عموماً مغربی نظریات کی تعبیر و تفسیر میں اپنے مؤقف کو اوّلیت دی گئی ہے اور نظریے کو اس سے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور جہاں یہ ہم آہنگی محال محسوس ہوئی ہے، وہاں نظریے کو مسترد کرنے میں مستعدی دکھائی گئی ہے۔ نیز جہاں مؤقف محض ایک تاثر ہے، وہاں کافی مضحک صورت پیدا ہوئی ہے۔ مثلاً آرنلڈ کے تنقید حیات، کے نظریے کی بیش تر تعبیر تاثر پر مبنی مؤقف کی روشنی میں کی گئی ہے۔ یہ تاثر دراصل تنقید کا عمومی مفہوم ہے: کھرے کھوٹے میں امتیاز! چناں چہ یہ سمجھا گیا کہ ادب کا کام زندگی کے خیر و شر میں امتیاز کرنا ہے، یہ مفہوم ادب کو اخلاقیات کے دائرے میں لے جاتا ہے اور ادب کی اپنی نہاد کو قائم نہیں رہنے دیتا۔ واضح رہے کہ ادب کی حقیقی نہاد اخلاقیات کے اصولوں کے الٹ یا منافی نہیں ہوتی، صرف مختلف ہوتی ہے۔ ادب، غیر اخلاقی نہیں، جمالیاتی ہوتا ہے۔ اخلاق اور جمال انسانی فطرت کے دو الگ دائرے ہیں جو ایک ہی شخص میں موجود ہوتے اور اس کی تکمیل میں اپنے اپنے اصولوں کے تحت مدد دیتے ہیں۔

اسی سے ملتی جلتی صورت ہمیں جیلانی کامران کے یہاں بھی دکھائی دیتی ہے۔ انھوں نے مغرب کے تنقیدی نظریے (دو جلدیں) میں جہاں ۱۹۶۰ء کے بعد کی مغربی تنقید کو موضوع بنایا ہے، وہاں اپنے مذہبی ثقافتی مؤقف کو پیشِ نظر ہی نہیں مقدم بھی رکھا ہے۔ چناں چہ انھیں نئی تنقیدی تھیوری کو قدم قدم پر ہدفِ تنقید و طنز بنانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ طنز سے بالعموم وہیں کام لیا جاتا ہے جہاں مصنف اپنے مؤقف کو ایک علمی معاملے کے بجائے، ایک ایسا اقداری تصور قرار دے جس کے منہدم ہونے کا اندیشہ بھی ہو۔ جیلانی کامران نے جہاں جہاں تنقیدی تھیوری کے بنیادی تصورات پر لکھا ہے، وہاں انھیں مسلسل اپنے تہذیبی مؤقف کو ان کے مقابل ظاہر کرنے کی ضرورت کا دباؤ محسوس ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تھیوری کے کسی ایک تعقل کو اس کے اصل تناظر میں واضح کرنے سے پہلے ہی اپنا مؤقف تھیوری کی ادھوری اور بعض صورتوں ناقص تفہیم پر لاد دیتے ہیں۔ اس سے عجب مضحکہ خیزی کی صورت سامنے آتی ہے۔ صرف ایک اقتباس دیکھیے:

> ژاکو دریدا نے ڈی کنسٹرکشن (حقائق کی نئی تشکیل) کے بارے میں کہا ہے کہ متوازی اور برعکس (Reverse) کیفیت بھی شے پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔ مطالعے کے مسائل اور نشانیات کے آڑے ترچھے خدوخال کسی خاص منزل تک رہنمائی نہیں کر سکتے اور ژاکو دریدا کے تشکیلی تجزیے میں بھی محض اقدار کے دوسرے رخ کا مشاہدہ بھی کوئی مفید مقصد بھی فراہم نہیں کرتا۔ الفاظ اور شعور کا باہمی فاصلہ برابر قائم رہتا ہے، اور متن پوری طرح مطالعاتی عمل کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔ سگنی فائر اور سگنی فائیڈ کے کبھی ختم نہ ہونے والے سلسلے سے کوئی منزل تب تک برآمد نہیں ہو سکتی جب

تک کہ یہ سلسلہ کسی میٹا فزیکل تصور کائنات یا مذہبی افکار کی صداقتوں کو اپنی بیرون ترین سرحد کے طور پر قبول نہیں کرتا۔لیکن ژاکو دریدا ایسے کسی خارجی اور ماوارئی حدود اربعے کو تسلیم نہیں کرتا اور جب اس کا آخری سگنی فائر نمایاں ہوتا ہے تو وہ ایک سکوت بسیط کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے۔

(مغرب کے تنقیدی نظریے ،جلد۲،ص۲۴۴)

ڈی کنسٹرکشن کو حقائق کی نئی تشکیل کہنا،ایجاد بندہ ہے۔ڈی کنسٹرکشن متن کی ایک خاص صورت حال یا وقوعہ ہے؛اسے نقاد متن پر مسلط نہیں کرتا،اس کو اپنے مطالعے کے دوران میں دریافت کرتا ہے۔اس کے مطابق متن کے ایک معنی کے التوا کا سامان خود اسی متن میں مضمر ہوتا ہے۔جہاں تک متوازی اور برعکس کیفیت کے متن کے معانی پر اثر انداز ہونے کی بات ہے تو یہ ایک فکر انگیز بات ہے۔بہت سادہ مثال سے اسے ہم سمجھ سکتے ہیں۔مرد اور عورت یا رات اور دن ایک دوسرے کے ضدِ مخالف ہیں۔ہم مرد اور دن کے معانی ،ان کے برعکس لفظوں عورت اور رات کے مقابل رکھ کر قائم کرتے ہیں،خواہ وہ ہماری گفتگو میں نہ آئیں۔اسی طرح مشرق کا تصور مغرب کے مقابل کیا جاتا ہے؛ایک کی مثبت خصوصیات ،دوسرے کی منفی خصوصیات کے متوازی قائم کی جاتی ہیں۔انھیں آپ آڑے ترچھے مسائل کہہ کر ان سے جان نہیں چھڑا سکتے۔دریدا چوں کہ معانی کے لامتناہی التوا کا قائل ہے ،اس لیے کسی متن کی حتمی تفہیم کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔اس بحث میں مذہبی افکار کی صداقت کو لانا،اس خوف کا اظہار ہے کہ کہیں معنی کی لامتناہی تکثیریت مذہبی فکر کی وحدت کے تصور پر اثر انداز نہ ہو۔سوچنے والی بات یہ ہے کہ ادبی متن کے مطالعے کے طریقوں کی بحث میں مذہبی فکر کی وحدت کے متاثر ہونے کا ہمیں خوف کیوں لاحق ہوجاتا ہے؟یہی نہیں اس خوف کا غلبہ اس درجہ کیوں ہوتا ہے کہ ہم ادبی متن کے مطالعاتی طریقوں کی ان کے حقیقی تناظر میں صراحت ہی سے قاصر ہوتے ہیں؟جیلانی کامران نے دریدا کی ناقص تفہیم ہی پیش نہیں کی،اپنے مؤقف کا بے محل اور بے محابا اظہار کر کے دریدا کی غلط تفہیم بھی کی ہے۔ڈی کنسٹرکشن کے کتنے ہی تنقیدی وتعبیری مضمرات ہیں،ان سے اختلاف کی گنجائش بھی ہے، اس طرف توجہ نہیں دی گئی۔یہ صورت تنقیدی تھیوری کے دیگر مباحث کے سلسلے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔یہاں دریدا کا نہیں ،خالص علمی وتنقیدی مباحث کی طے شدہ رسمیات کا دفاع مقصود ہے۔

مغربی نظریات کو ان کے اپنے تناظر، تاریخ اور دیگر نظریات کے مقابلے میں رکھ کر دیکھنے کی مثالیں ہمیں ان کتابوں میں ملتی ہیں جنھیں نصابی کتب کے طور پر تصنیف نہیں کیا گیا۔کلیم الدین احمد،آل احمد سرور،احتشام حسین،محمد حسن ،محمد حسن عسکری ،وزیر آغا ، گوپی چند نارنگ ،شمس الرحمٰن فاروقی ،ضمیر علی بد ایونی ،قاضی افضال حسین،ابوالکلام قاسمی ،عتیق اللہ ،فہیم اعظمی ،سہیل احمد خاں اور حامدی کاشمیری کی تنقیدات میں ہمیں مغربی تنقید کے تصورات کو ایک واضح زاویہء نظر سے پیش کرنے کا رویہ ملتا ہے۔بلاشبہ ان سب ناقدین کی مغربی تنقید کی تشریحات سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے،مگر اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے مغربی تنقید کے بنیادی اور اہم متون کو بنیاد بناتے ہوئے اردو شعریات سے متعلق ثقافتی اور جمالیاتی سوالات کے جوابات تلاش کیے۔

حواشی

۱- مثلاً چند کتابوں سے یہ اقتباسات دیکھیے :

''تنقیدی دبستان'' ہر طرح کی تعلّی کے بغیر پیش کرنے کے باوجود تنقید کے پرچہ میں ۳۳ فی صد نمبر دلانے کا تو میں ذمہ لیتا ہوں۔''

(ڈاکٹر سلیم اختر، تنقیدی دبستان، ص ۸)

''میری رائے ہے کہ اس کتاب کے مطالعے سے نہ صرف ادب کے طالب علموں کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوں گی، بلکہ ایک عام قاری بھی اس کے مطالعے سے خوشی محسوس کرے گا۔''

(جیلانی کامران، مغرب کے تنقیدی نظریے، جلد اوّل، ص ا)

''بنیادی طور پر میں نے یہ کتاب طالب علموں کی ضروریات کے پیش نظر تالیف کی ہے۔''

(سجاد باقر رضوی، مغربی کے تنقیدی اصول۔ل)

۲- تاہم یہ ایک چشم کشا امر ہے کہ ممتاز لیاقت نے بکف چراغ دارد میں سجاد باقر رضوی اور سید وقار عظیم کے دو مضامین بالترتیب، ہنسی کے متعلق عرب حکما کے چند نظریات اور تاریخی ناول اور اس کا فن کو الفرڈ ٹریسڈ شپرڈ اور فرانز روزن تھل کی کتابوں کے تراجم ثابت کیا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھیے: بکف چراغ دارد صفحات ۸ تا ۱۱۰ اور ۱۱۱ تا ۱۳۱

۳- جیلانی کامران کی کتاب مغرب کے تنقیدی نظریے میں بعض مقامات پر تناظر کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس کی بجا طور پر تحسین کی جانی چاہیے، تاہم کئی مقامات ایسے بھی ہیں جہاں تناظر کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر سہیل عباس
پروفیسر شعبۂ اردو
جامعہ ٹوکیو برائے مطالعاتِ خارجی

اردو نصاب: آزادی سے پہلے

No one can deny the Muslim quest for knowledge.The concepts put by the Muslims form the basis of modern knowledge. The Muslim rulers have a major role in the intellectual decline that followed the fall of Baghdad. This essay presents an overview of the Muslim contribution and discuss the colonial Urdu text books of the colonial sub-continent.

جب ۱۱۸۷ء میں سلطان صلاح الدین نے بیت المقدس فتح کیا ،اس وقت تک علمی ،اخلاقی ،روحانی اور عسکری اعتبار سے مسلمانوں کا پلہ اہل مغرب پر بھاری تھا ۔اس کے بعد اسلامی ممالک پر منگولوں کی یورش ہوئی اور ۱۲۵۸ء میں سقوط بغداد کا سانحہ پیش آیا ۔اس سیلاب بلا سے جو عظیم سیاسی و دینی خطرات پیدا ہو گئے تھے ۔وہ تو اللہ کے فضل سے عارضی ثابت ہوئے اور اہل یورپ نے لامذہب منگولوں سے مل کر دنیاے اسلام کے خلاف جو منصوبے بنانے چاہے ،انہیں بعض با تدبیر مسلمان زعما نے ناکام بنا دیا لیکن 'فتنہ مغول'(فتنہ منگول) نے مسلمانوں کی علمی برتری کا خاتمہ کر دیا ۔خوارزم ۔بخارا۔خراسان۔ایران اور بغداد کے علمی مرکزوں کی ویرانی ،کتب خانوں ،مدرسوں اور تجربہ گاہوں کی تباہی اور علما کے قتل و انتشار سے علم کا شیرازہ اس طرح بکھرا کہ پھر اس کی بحالی نہ ہو سکی بلکہ علم و تہذیب کے پرانے گہواروں میں اتنی دیر بربریت اور سفاکانہ جہالت کا دور دورہ رہا کہ ہمتیں پست ہو گئیں اور خیالات بدل گئے ۔مغلوں (منگولوں) کی تباہ کاریوں سے پہلے اور بعد کے حالات پر غور کریں تو ایسا نظر آتا ہے کہ وہ سانچا جس میں البیرونی جیسے محققین اور سائنس دانوں کے ذہن ڈھلتے تھے ،ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا۔واقعیت پسندی کی جگہ فراریت اور علم کی جگہ تصوف کو فروغ ہوا۔علم کا مفہوم بہت محدود ہو گیا ۔یعنی نئے علوم اخذ کرنا تو ایک طرف ،زوالِ بغداد سے پہلے جو علوم رائج تھے ،وہ بھی متروک ہو گئے ۔ذہن گویا مفلوج ہو گئے اور جو لوگ اہل علم کہلاتے تھے ان کا منتہائے مقصود حق کی تلاش نہ رہا بلکہ ایک نقطہ نظر کی ترویج۔

اس کے برعکس یورپ میں بالکل ایک نئی علمی زندگی کا آغاز ہوااور اس تحریک کی ابتدا ہوئی جسے یورپ کی نشاۃ ثانیہ یا Renaisance کہتے ہیں۔اس میں ایک حد تک ان اثرات کو دخل تھا جو صقلیہ اور اندلس میں عربوں کے بلند علمی اور تدریسی معیار کی بدولت قریبی یورپی ممالک کے اہل علم پر پڑا ۔صلیبی جنگوں کے دوران میں عربوں کے تمدن اور علم وفن سے اہل مغرب کو جو واقفیت ہوئی ،اس سے بھی ان کا افق ذہنی وسیع اور معیار علمی بلند ہوالیکن یورپ کی علمی نشاۃ ثانیہ کا اصل ذریعہ وہ یونیورسٹیاں تھیں، جو اس زمانے میں کثرت سے یورپ کے مرکزوں میں قائم ہوئیں ۔اس وقت وہاں بھی (عالم اسلام کی طرح)تعلیم و تدریس کی باگ علمائے مذہب کے ہاتھ میں تھی (مثلاً آکسفورڈ اور کیمبرج کی یونیورسٹیاں بھی شروع میں دینی درس گاہیں تھیں)لیکن یورپ

میں ضروریات زمانہ کے لحاظ سے نصاب میں توسیع ہوتی رہی اور یہ یونیورسٹیاں دینی اور دنیوی دونوں قسم کے علوم کا مرکز بن گئیں۔ اس زمانے میں یورپ میں چھاپہ خانہ کا آغاز ہوا ،جس سے علم کی بے پناہ اشاعت ہوئی ۔کتابیں سستی ہوگئیں اور کتب خانے خاص خاص امرا یا اداروں کا اجارہ ہونے کی بجائے عوام کو بھی میسر ہونے لگے ۔اس کے علاوہ مغرب کی عسکری برتری کا ،بالخصوص سمندروں پر اس کے بے روک ٹوک اقتدار کا آغاز بھی اس زمانے میں ہوا اور اکبر کی تخت نشینی ،بلکہ بابر کی فتح پانی پت سے پہلے بحر ہند ایک 'پرتگیزی جھیل' بن گیا تھا،جس میں جہاز رانی پرتگیزی اجازت ناموں کے بغیر مخدوش بلکہ ناممکن تھی ۔(۱)

دہلی میں اسلامی حکومت اس وقت قائم ہوئی ،جب منگولوں کے سیلابِ بلا کے بند ٹوٹ چکے تھے ۔ان درندوں سے جان بچا کر جو علما وصلحا بخارا ،خوارزم ،خراسان اور پھر ایران ،عراق سے بھاگ کر ہندوستان میں پناہ گزین ہوئے ۔ان کے یہاں اشاعت اسلام ،نئی حکومت کے استحکام اور اسلامی تہذیب وتمدن کی زیب وآرائش میں بڑی مدد ملی ،لیکن جو افراد اس طرح جان بچا کر بھاگے تھے ،وہ اپنے کتب خانے ساتھ نہ لا سکے تھے ۔تجربہ گاہوں اور علمی آلات کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں انہی چیزوں نے فروغ پایا ،جن کے لیے صدیوں کے جمع کیے ہوئے علمی سرمایہ کی ضرورت نہ تھی ۔یعنی تصوف ،شعر وشاعری ،انشا،زیادہ سے زیادہ فقہ اور اصول حکومت پر چند کتابیں اور مقامی تاریخ نگاری۔(۲)

مغلیہ نظام اور تہذہب وتمدن اپنے دور میں کسی دوسری مشرقی حکومت کے نظام سے پیچھے نہ تھا بلکہ روسی مورخ بارٹولڈ لکھتا ہے۔''فقط ہندوستان میں مغلوں کے تابع حالات مختلف تھے اور اس ملک کی اسلامی حکومت مال وثروت اور مذہبی رواداری میں معاصرانہ یورپ سے بڑھ کر تھی۔''تمام یورپ میں مغلوں کو مغلانِ اعظم کہہ کر یاد کیا جاتا تھا ،لیکن جب دو ڈھائی سو سال بعد مغلیہ حکومت کے خاتمے کا وقت آیا تھا تو نہ صرف یہ ہندوستان تنازع للبقا کی جنگ میں یورپ سے آگے یا اس کے برابر نہ رہا ،بلکہ ایک یورپی طاقت کے زیر نگیں آ گیا ۔مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے تجدید و احیائے دین میں مجددین اور اسلامی علما و زعما کے 'اسباب ناکامی' کا تجزیہ کیا ہے اور مغرب کے مقابلے میں مشرق کی ذہنی اور علمی پسماندگی کا نقشہ کھینچا ہے وہ لکھتے ہیں۔''جس دور میں ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ صاحب ،شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ اسمٰعیل شہید پیدا ہوئے ۔اسی دور میں یورپ قرون وسطیٰ کی نیند سے بیدار ہو کر نئی طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا اور وہاں علم وفن کے محققین ،مکتشفین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے کہ انہوں نے ایک دنیا کی دنیا بدل ڈالی۔''اس کے بعد وہ آدھے پونے صفحے پر اٹھا رویں ،انیسویں صدی کے مشہور مغربی حکما ،سائنسدانوں اور معاشیات وغیرہ کے ماہرین کے نام گنا کر کہتے ہیں کہ ان میں''ان جیسے لوگ پیدا ہوئے ،جنہوں نے اخلاقیات ،ادب،قانون، مذہب ،سیاسیات اور تمام علوم عمرانی پر زبردست اثر ڈالا اور انتہائی جرات و بے باکی کے ساتھ دنیائے قدیم پر تنقید کر کے نظریات و افکار کی ایک نئی دنیا بنا ڈالی ۔پریس کے استعمال ،اشاعت کی کثرت ،اسالیب بیان کی ندرت اور مشکل اصطلاحی زبان کے بجائے عام فہم زبان کو ذریعہ اظہار بنانے کی وجہ سے ،ان لوگوں کے خیالات نہایت وسیع پیمانے پر پھیلے ۔انہوں نے محدود افراد کو نہیں بلکہ قوموں کو بحیثیت مجموعی متاثر کیا ۔ذہنیتیں بدل دیں ،اخلاق بدل دیے۔نظام تعلیم بدل دیا۔نظریہ حیات اور مقصد زندگی بدل دیا اور تمدن و سیاست کا پورا نظام بدل دیا۔۔۔اسی زمانے میں مشین کی ایجاد نے صنعتی انقلاب برپا کیا۔جس نے ایک نیا تمدن ،نئی طاقت

اور نئے مسائلِ زندگی کے ساتھ پیدا کیا ۔اسی زمانے میں انجینئرنگ کو غیر معمولی ترقی ہوئی ،جس سے یورپ کو وہ قوتیں حاصل ہوئیں کہ پہلے دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ تھیں ۔اسی زمانے میں قدیم فنِ جنگ کی جگہ نیا فنِ جنگ ،نئے آلات اور نئی تدابیر کے ساتھ پیدا ہوا۔باقاعدہ ڈرل کے ذریعہ سے فوجوں کو منظّم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا ،جس کی وجہ سے میدانِ جنگ میں پلٹنیں مشین کی طرح حرکت کرنے لگیں ۔اور پرانے طرز کی فوجوں کا ان کے مقابلے میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ص۷۶۔۷۷(۳)

اکبر کے زمانے میں درس و تدریس میں کئی نمایاں تبدیلیاں ہوئیں ۔خلجی اور تغلق خاندانوں کے زمانے میں علوم وفنون کی کتابیں ہندوستان میں کم تھیں اور فقہ اور اصولِ فقہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی ۔لودھیوں کے زمانے میں معقولات کی چند کتابیں بڑھیں،لیکن اکبر کے عہد میں معقولات میں بہت اضافہ ہوا ۔اس کی ایک وجہ ایران اور سمرقند سے بعض علما کی آمد تھی ۔جنھوں نے منطق اور فلسفے کو رواج دیا ۔ان میں شاہ فتح اللہ شیرازی بہت ممتاز تھے جنہیں اکبر نے عضد الملک کا خطاب دیا تھا۔شاہ سلیمان سجادہ نشین پھلواری شریف کا خیال ہے کہ درس نظامی کے اصل بانی یہی ملا فتح اللہ شیرازی تھے ۔وہ الندوہ کے ایک پرچے میں لکھتے ہیں۔''اسی کے قریب زمانے میں ملا فتح اللہ شیرازی کے درس و تدریس کا غلغلہ بلند ہوا اور ہندوستانی علما عموماً اور اہل یورپ خصوصاً انھیں کے اندازِ تعلیم پر چلنے لگے۔ان کے وقت سے گویا ایک جدید نصابِ تعلیم قائم ہوا۔۔۔میرا مقصود فقط یہ ہے کہ درس نظامی جس کا ہیولےٰ ملا فتح اللہ شیرازی سے ظہور میں آیا اور صورت نوعیہ نے اس کا روپ بدلا ۔یہاں تک کہ درس کا مروجہ موجودہ حال پر استقرار ہوا۔''(۴)

امیر فتح اللہ شیرازی جیسے بزرگ چاہتے تو یہاں بھی کم از کم منتخب اداروں میں سائنس کی تعلیم کا آغاز ہوسکتا تھا ۔مغرب میں اس وقت گلیلیو پیدا ہو چکا تھا ،جس نے نئی ایجاد شدہ دور بین کی مدد سے علم ہیئت اور فلکیات میں بنیادی تبدیلیاں کیں اور فی الحقیقت سائنس میں مغربی ترقیوں کے نئے دور کا آغاز کیا لیکن ہمارے ہاں یہ سلسلہ قائم نہ ہوا بلکہ امیر فتح اللہ شیرازی نے جو کلیں اور مشینیں ایجاد کیں ۔ان کا سلسلہ بھی انفرادی نمود و نمائش کے کھیل سے آگے نہ بڑھا۔اور یہ سلسلہ بھی امیر کے ساتھ ختم ہو گیا۔(۵)

برصغیر میں جب مولانا نظام الدین لکھنوی نے درسِ نظامی شروع کیا تو اس میں علمِ ادب بھی شامل کیا جس میں قصائد ولغت حماسہ ،مقامات بدیعی وحریری ،مثنوی معنوی (تصانیف دینی شاہ ولی اللہ و شاہ اسماعیل کے علاوہ)شامل تھے ۔پروفیسر آر ۔اے ۔نکلسن نے اپنی تاریخ ادبیاتِ عرب میں جو فہرست علوم درسی کی پیش کی ان میں علم ادب کو آخر میں رکھا ہے۔(۶)

اکبر کے پچاس سالہ عہد حکومت میں اس کی طرف سے فیروز تغلق کے قائم کردہ مدرسہ فیروزی یا ابتدائی اسلامی حکومت کے مدرسہ معزیہ یا مدرسہ ناصریہ کے پایہ کی کسی علمی درسگاہ کے قیام کا کہیں ذکر نہیں۔

چھاپہ خانہ سے بے اعتنائی عہد اکبری کا افسوسناک واقعہ ہے ۔عہد اکبری سے بہت پہلے یورپ میں چھاپہ خانہ کی ایجاد ہو چکی تھی اور اکبر کے زمانے میں ہندوستان کے مغربی ساحل پر پرتگیزوں نے چھاپہ خانے قائم کر رکھے تھے ۔اکبر کے سامنے یہ کتابیں

پیش بھی ہوئیں لیکن اس نے انہیں (خوشنما خطاطی کے مقابلے میں ابتدائی عہد کی بری چھپائی کو دیکھ کر)پسند نہ کیا اور علم کی وسیع اشاعت کا سب سے کارآمد ذریعہ ہاتھ سے کھو دیا۔عہد عالمگیری کا ایک سیاح Orington لکھتا ہے کہ کاتبوں کے اقتصادی مفاد کی خاطر مغلوں نے چھاپہ خانہ کو رواج نہ دیا۔

عہد اکبری کی ان کتابوں کا جو شاہی سرپرستی میں ترجمہ ہوئیں کا مقابلہ اگر ہم دور عباسیہ میں بغداد کے دارالحکمت میں ترجمہ کی گئیں کتب (جو یونانی یا سنسکرت سے عربی میں منتقل ہوئیں)سے کریں تو اکبر کی علم دوستی پر حیرت ہوتی ہے۔عہد اکبری میں جو کتابیں ترجمہ ہوئیں یا لکھی گئیں ۔ان میں بعض کتابیں تو ہنود کی مذہبی کتابوں کا ترجمہ تھیں جن کا مقصد ظاہر ہے سیاسی تھا۔بعض داستانیں اور افسانے تھے جن کے ترجمہ کا مقصد بادشاہ اور بیگمات کی ضیافت طبع تھا۔چند کتابیں تاریخ کی تھیں ۔اس ساری فہرست پرغور کریں تو خالص علمی کتابیں فقط دو یا تین نظر آتی ہیں ۔ایک ریاضی میں 'لیلا وتی' کا ترجمہ،دوسری علم ہیئت میں ۔(۷)

اورنگ زیب نے اپنے استاد کے سامنے اس زمانے کے طرز تعلیم پر جو تنقید کی اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس زمانے کے طریقہ تعلیم کی کوتاہیوں سے پوری طرح واقف تھا۔برنیر اپنے سفرنامے میں لکھتا ہے کہ اورنگ زیب کی تخت نشینی کے بعد جب اس کا ایک استاد کسی منصب کی ہوس میں اس کے دربار میں آیا اور درباری امرا سے جوڑ توڑ کر کے ایک بلند پایہ منصب لینے کے درپے ہوا تو اورنگ زیب نے ایک دن اسے تخلیے میں بلا کر ایک طویل تقریر کی اور کہا''مولنا ! آپ کی کیا خواہش ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کو دربار کے اول درجہ کے امرا میں داخل کر لوں؟ میں جانتا ہوں کہ آپ کا مجھ پر حق ہوتا اگر آپ مجھے کوئی کام کی تعلیم دیتے لیکن آپ نے مجھے کیا پڑھایا؟ آپ نے مجھے بتایا کہ فرنگستان ایک معمولی سا جزیرہ ہے ،جہاں سب سے بڑا بادشاہ پہلے پرتگال کا حاکم تھا۔پھر ہالینڈ کا بادشاہ ہوا اور اب شاہ انگلستان ہے ۔فرانس اور اندلس کے حکمرانوں کے متعلق آپ نے مجھے بتایا کہ وہ ہمارے معمولی راجاؤں کی طرح ہیں اور شاہنشاہانِ ہندوستان ان سب حکمرانوں سے بڑے ہیں ۔انہی میں ہمایوں ،اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں ہوئے ۔جو شاہانِ عظیم ،فاتحانِ جہان اور بادشاہانِ عالم ہیں ۔آپ نے مجھے بتایا کہ ایران ،کاشغر، تاتار، پیکو،سیام اور چین کے حاکم شاہ ہند کا نام سن کر کانپتے ہیں ۔سبحان اللہ! آپ کے علم جغرافیہ اور تاریخ دانی کا کیا کہنا! کیا آپ کا فرض نہ تھا کہ آپ مجھے دنیا کی تمام قوموں کی خصوصیات سے آگاہ کر کے یہ بتاتے کہ ان ملکوں کی پیداوار اور ان کی جنگی طاقت کا کیا حال ہے ۔یہ لوگ لڑتے کس ڈھب سے ہیں ۔ان کے رسم و رواج اور مذہب وحکومت کے طریقے کیسے ہیں ؟ان کی پولیٹیکل پالیسیاں کیا ہیں؟ آپ کا فرض تھا کہ مجھے تاریخ کی باقاعدہ تعلیم دے کر حکومتوں کے آغاز اور ان کی ترقی وتنزل کے اسباب بتاتے ۔ ان واقعات ،حادثات اور غلطیوں سے آگاہ کرتے جن کی وجہ سے بڑے بڑے انقلابات ظہور میں آتے ہیں۔خیر دنیا کی تاریخ سے پوری اور گہری واقفیت دلانا تو درکنار آپ نے مجھے میرے آباو اجداد کے نام بھی پوری طرح نہیں بتائے۔

آپ نے یہ خیال نہ کیا کہ ایک شہزادے کی تعلیم کے لیے کون سے مضامین درکار ہیں۔یہی سمجھا کہ مجھے بس صرف ونحو کی بڑی مہارت چاہیے اور مجھے وہ علم حاصل کرنا چاہیے جس کی ضرورت ایک قاضی یا فقیہ کو ہوتی ہے ۔اس طرح آپ نے میری جوانی

کا قیمتی زمانہ لفظوں کو سیکھنے کی خشک اور بے فائدہ اور لامتناہی کوشش میں صرف کر دیا۔

آپ نے میرے والد ماجد سے کہا کہ ہم نے اسے فلسفہ پڑھایا ہے۔یہ صحیح ہے کہ آپ نے کئی برس تک میرے دماغ کو ان فضول اور احمقانہ مسائل سے پریشان کیا جن کا زندگی کے کاروبار سے کوئی تعلق نہیں۔بے شک آپ نے میری زندگی کے بہترین سال اپنے دل پسند لیکن خیالی مسائل کی بحث میں صرف کر دیئے۔جب میری تعلیم ختم ہوئی تو مجھے علم وفن سے سوائے اس کے کوئی واقفیت نہ تھی کہ میں چند ایسی دقیق اور مشکل اصطلاحیں استعمال کر سکتا تھا جن سے روشن دماغ والے انسان گھبرا جاتے ہیں اور جن سے فلسفہ کے دعویدار اپنی جہالت اور ناواقفیت پر پردے ڈالتے ہیں!

اگر آپ مجھے وہ علم سکھاتے جو عقل اور سمجھ کے اصولوں پر دماغ کی تربیت کرتا ہے اور اسے صحیح اور وزنی دلائل کا طلبگار بناتا ہے یا مجھے وہ باتیں بتاتے جن سے حوادثِ زمانہ کے مقابلے میں انسان اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ نہ مصائب اسے پریشان کرتی (کرتے) ہیں اور نہ خوشی اور کامیابی سے اس کا دماغ بگڑتا ہے۔یا اگر آپ مجھے انسانی فطرت کے رموز سے واقف کر دیتے یا مجھے دنیا کا،اس کے مختلف حصوں کا اور اس کے نظام کا پورا پورا حال بتا دیتے تو مجھ پر آپ کے احسانات سکندر اعظم پر ارسطو کے احسانات سے بڑھ کر ہوتے اور میں پوری طرح آپ کی قدر افزائی کرتا۔''

شیخ اکرام 'رود کوثر' میں لکھتے ہیں ''اب بعض اہل تحقیق کہتے ہیں کہ یہ تقریر برنیر کے نہانخانہ دماغ کی تخلیق ہے۔عالمگیر کے خیالات کا اظہار نہیں۔ممکن ہے یہ شبہ جائز ہو،لیکن اس سے اصل بحث پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔جو اعتراضات اس میں درج ہیں،وہ فی نفسہ اس قدر وزنی ہیں کہ انہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور کیا یہ امر قابل افسوس نہیں کہ جو کوتاہیاں ایک ژرف بیں اجنبی کو تھوڑے ہی قیام کے بعد نظر آ گئیں،ان سے ہمارے اربابِ حل وعقد اتنی صدیاں غافل رہے؟(۸)

اس دور میں علوم کی تدریس کا انداز فلسفیانہ تھا۔اردو نصاب میں منظوم لغات کی کثیر تعداد نظر آتی ہے،جن کا مقصد صرف عربی فارسی الفاظ کے اردو مترادفات کی فہرست فراہم کرنا تھا۔ان منظوم نصابات کے کچھ نسخے میرے کتب خانے میں بھی ہیں،جن کی فہرست درج ذیل ہے:

۱۔ رسالہ اللہ خدائی۔در مطبع نامی کریمی واقع بمبئی

۲۔ خالق باری۔در مطبع نامی کریمی واقع بمبئی

۳۔ لغات سعید۔در مطبع نامی کریمی واقع بمبئی

۴۔ واسع باری۔مرتبہ گوہر نوشاہی

۵۔ خالق باری اکرم۔در مطبع مصطفائی۔محمد مصطفیٰ خان

۶۔ نصاب ضروری۔خالق باری

۷۔ رسالہ اردو۔حفظ اللسان

۸۔ حمد باری ۔مولانا عبدالسمیع بیدل۔حاشیہ قاضی سجاد حسین۔ناشر سب رنگ کتاب گھر دہلی

۹۔ فارسی نامہ۔حافظ عبدالرحمٰن ابن محمد قاسم۔(واحد باری ۔اللہ باری۔صمد باری)

۱۰۔ مفید عام۔در مطبع المطابع۔مولفہ فضل عظیم ۔۱۲۸۲ھ/۱۸۶۵ء

۱۱۔ خوشحال الصبیان۔محمد وزیر۔در مطبع خاص فیض اختصاص گلزار محمدی

۱۲۔ عباس نامہ۔محمد عباس شروانی۔در مفید عام آگرہ

۱۳۔ رسالہ جان پہچان۔شیخ کیول رام۔در مطبع صفدری

۱۴۔ فارسی نامہ کلاں

۱۵۔ قادر نامہ ۔غالب

۱۶۔ مرشد ہادی۔بیت اللغات۔منشی سورج پرشاد۔مطبع محمدی کانپور

۱۷۔ نصاب خسرو۔خالق باری۔مولوی نذیر احمد۔مطبع انسٹی ٹیوٹ علی گڑھ۔۱۹۱۹ء

۱۸۔ خالق باری ۔نول کشور

۱۹۔ رسالہ ہفت زبان۔حمیدیہ پریس دہلی

۲۰۔ نصاب عجاب۔ریاض فرح۔مطبع سوسائٹی بریلی

۲۱۔ فیض شاہجہانی۔محمد عبدالصمد۔مطبع احمد کانپور

۲۲۔ رسالہ فیض جاری۔میر شمس الدین۔مطبع نامی منشی نولکشور۔۱۸۸۲ء

۲۳۔ نصاب الصبیان۔ابونصر فراہی۔مطبع محمدی

۲۴۔ کلید زبان پشتو۔منشی کریم بخش۔مطبع متر ولاس لاہور

۲۵۔ منظومۃ المصادر۔شیخ علی احمد۔مطبع عزیزی محمد عبدالعزیز۔کانپور

۲۶۔ مفید الحبث ۔منشی جمعیت علی۔شرف المطابع ۔۱۸۹۷ء

۲۷۔ ترمیم شدہ خالق باری مع شرح۔منشی محمد بلاقی۔مطبع حدیقۃ العلوم۔میرٹھ

۲۸۔ سبحان باری۔مطبع احمدی دبدبہ لکھنو

۲۹۔ حمد باری۔غنی احمد۔مطبع رزاقی کانپور

۳۰۔ چراغ فوائد۔مطبع سفیر دکن رونق

۳۱۔ قادر نامہ فروغی۔محمد ابوسعید خان۔مطبع نظامی کانپور

۳۲۔ نصاب ضروری۔مطبع مصطفائی لاہور

۳۳۔ گنج فارسی۔الیکٹرک ابوالعلائی پریس آگرہ

انگریزی عہد کے نظام تعلیم اور انداز تدریس کو خواہ ہم نوآبادیاتی تناظر میں ہی دیکھیں ،ایک بات سوچنے کی ہے کہ اس سے پہلے کے دور میں ہم اس کے متبادل کیا پڑھا رہے تھے۔

انگریزی عہد میں مدارس میں جو نصاب پڑھایا جاتا تھا۔خواہ وہ سرکاری مدارس تھے یا غیر سرکاری ،انیسویں اور بیسویں صدی کے ان نصابات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ''ٹوکیو یونی ورسٹی آف فارن سٹڈیز''میں موجود ہے ۔اس میں شعبۂ ہندوستانی جس میں اردو اور ہندی شامل ہیں ۱۹۰۸ء میں قیام ہوا۔ان نصابات میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

(۱) اردو کی دوسری کتاب

فہرست:(۱)ماں کی محبت (۲)لڑکے کھیل رہے ہیں (۳)لڑکا مدرسے جاتا ہے (۴)پہلوان کشتی لڑ رہے ہیں (۵)بگھی کا گھوڑا (۶)کسان کُوآں چلاتا ہے (۷)کسان ہل جوت رہا ہے (۸)جُلاہا کپڑا بُن رہا ہے (۹)مری پیاری اماں (۱۰)صبح کی ہوا خوری (۱۱)دریا میں تیراک تیر رہے ہیں (۱۲)گاے (۱۳)سویرے اٹھنا (۱۴)مچھلی والے مچھلیاں پکڑ رہے ہیں (۱۵)کوے کی کہانی (۱۶)نیزہ بازی (۱۷)بھینس (۱۸)کھیت کی سیرا (۱۹)کھیت کی سیر ۲ (۲۰)کبوتر (۲۱)تین نیک بچے (۲۲)ہمدردی (۲۳)گھوڑا (۲۴)دن اور رات (۲۵)تارے (۲۶)اونٹ (۲۷)برسات (۲۸)پیپل (۲۹)بڑ (۳۰)آج کا کام کل پر چھوڑنا (۳۱)سچائی (۳۲)بڑھئی(۳۳)گیہوں (۳۴)گنبد کی آواز(۳۵)آم(۳۶)لوہا(۳۷)گرمی(۳۸)ایک عقلمند چوہا(۳۹)ٹھیک وقت معلوم کرنا(۴۰)گنّا(۴۱)کُتّا (۹)

(۲) انڈین پریس ریڈر،دوسری کتاب ۔پہلا حصہ،اپر پرائمری جماعت کے لئے

فہرست:(۱)پیڑا(۲)پیڑ۲(۳)ہمارا بدن(۴)سانپ۱ (۵)سانپ۲(۶)کانچ یا شیشہ(۷)سورج(۸)گھر والے جانور(۹)سورج سے ہمکو کیا فائدہ ہے (۱۰)مورچہ لگی ہوئی بندوق(۱۱)بکری (۱۲)لچھمن کا چاقو(۱۳)پھول(۱۴)مگر(۱۵)ایک گھر میں آگ لگنا(۱۶)گھوڑا(۱۷)شہر اور گانوں(۱۸)نمک(۱۹)مچھر(۲۰)ہوا (۲۱)شہد کی مکھی ۱ (۲۲)شہد کی مکھی ۲(۲۳)لوہا(۲۴)پیڑ کس طرح جیتے ہیں(۲۵)آدمی کا بدن (۱۰)

(۳) اردو ریڈر،ورنا کیولر مدارس کے لڑکوں کی تیسری و چوتھی جماعت کے واسطے

فہرست:(۱)سورج(۲)ایک سیانا کوا(۳)پرتھی راج(۴)چار دوستوں کی کہانی(۵)کبیر(۶)ہوا(۷)اکبر بادشاہ(۸)سمجھ دار بیٹا (۹)مینھ(۱۰)ایک قاضی کا انصاف(۱۱)چاند بی بی(۱۲)جیسے کو تیسا(۱۳)جہانگیر کا مقبرہ(۱۴)بیج(۱۵)جو بوؤ گے وہی کاٹو گے (۱۶)ایک لالچی کی کہانی(۱۷)اچھی بُجھائی کا فائدہ(۱۸)ایک چالاک لومڑی(۱۹)جیسا بیج ویسا پھل (۲۰)تاج محل(۲۱)بیج سے پودے کس طرح اُگتے ہیں(۲۲)اپنا کام اپنے ہاتھوں خوب ہوتا ہے(۲۳)پودھا(۲۴)اہلیا بائی(۲۵)پودھوں کے پتّے یا پتیاں (۲۶)سیوا کرے سو میوہ کھائے (۲۷)پھول(۲۸)آصف الدولہ کا امام باڑہ(۲۹)تندرستی ۔ہوا(۳۰)کاشتکاری میں لکھنے پڑھنے کے فائدے(۳۱)تندرستی کھانا (۳۲)بہادری(۳۳)تندرستی ۔پانی(۳۴)وفاداری(۳۵)بیماری سے بچنے کے قاعدے(سونا۔کھانا ۔ اورکسرت) (۳۶)اتفاق کا نتیجہ(الف)(۳۷)اتفاق کا نتیجہ(ب)(۳۸)بیماری سے بچنے کے قاعدے(نہانا)(۳۹)بیماری سے بچنے کے قاعدے(صفائی) (۴۰)محنت ،ورزش ،اور تندرستی(۴۱)راجہ رام موہن رائے(۴۲)جانوروں پر مہربانی(۴۳)سرسید احمد خاں(۴۴)بادشاہ اور کسان (۴۵)ملکۂ وکٹوریہ(۴۶)پنچائتی بنک (۱۱)

(۴) شرح ابتدائی نصاب اردو

فہرست:(۱)خدا کی تعریف(نظم)مولوی اسمٰعیل میرٹھی(۲)قصہ حاتم طائی(نثر)میر امن دہلوی(۳)بچے کی دعا(نظم)علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال(۴)گذرا ہوا زمانہ(نثر)سرسید احمد خاں(۵)ترانہ ملّی(نظم)علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال(۶)حالی کی سوانح عمری (نثر)خواجہ الطاف حسین حالی(۷)انتخاب مسدس(نظم)خواجہ الطاف حسین حالی(۸)نقد کا سودا(نظم)نظیر اکبر آبادی(۹)نیک صحبت کا اثر(نثر)مولوی نذیر احمد دہلوی(۱۰)برکھا رت(نظم)خواجہ الطاف حسین حالی(۱۱)مٹیا برج کے حالات(نثر)عبدالحلیم شرر (۱۲)بارش کا پہلا قطرہ(نظم)مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی(۱۳)سرسید احمد خاں(نثر)ڈاکٹر مولوی عبدالحق(۱۴)اردو زبان کی حقیقت(نثر)ڈاکٹر محمد ابواللیث صدیقی (۱۲)

ان نصابات سے کئی اہم مطالعے سامنے آتے ہیں ۔اس دور کے موضوعات اور عالمی تناظر،اس دور کی املا،اعراب کا خصوصی اہتمام،فارسی کے برخلاف لفظوں کو توڑ کر لکھنا،تہذیبی تعارف اور ذخیرہ الفاظ کا مطالعہ کئی نئے امکانات سامنے لائے گا۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں ان کتابوں کی شرحیں بھی لکھی جاتی تھیں۔کسی وقت ان نصابات کا تفصیلی تعارف کرایا جائے گا۔

حوالہ جات

۱۔ اکرام،شیخ محمد ،رود کوثر، ادارۂ ثقافت اسلامیہ،لاہور،۲ کلب روڈ،نومبر ۱۹۹۷ء۔ص ۱۶۷ تا ۱۶۹

۲۔ ایضاً۔ص ۱۷۲

۳۔ ایضاً۔ص ۱۶۶۔۱۶۷

۴۔ ایضاً۔ص ۱۶۲

۵۔ ایضاً۔ص ۱۷۶

۶۔ کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ۔ جابر علی سید،حواشی وتعلیقات وارث سرہندی،جلد اول ۔ اسلام آباد:مقتدرہ قومی زبان،طبع اول ۱۹۸۴ء۔ص۲۳

۷۔ شیخ محمد اکرام ،رود کوثر،ادارۂ ثقافت اسلامیہ، لاہور:۲ کلب روڈ،نومبر ۱۹۹۷ء۔ص۱۷۴

۸۔ ایضاً۔ص۴۶۴تا۴۶۶

۹۔ اردو کی دوسری کتاب ،مرتبہ پنجاب ٹیکسٹ کمیٹی لاہور ۔رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز ،ایجوکیشنل پبلشرز ،۱۹۳۰ء

۱۰۔ انڈین پریس ریڈر ،دوسری کتاب۔ پہلا حصہ،اپر پرائمری جماعت کے لئے ،الہ آباد:انڈین پریس ،۱۹۱۶ء

۱۱۔ اردو ریڈر،ورنا کیولر مدارس کے لڑکوں کی تیسری و چوتھی جماعت کے واسطے،لکھنؤ:نولکشور پریس،۱۹۲۰ء

۱۲۔ شرح ابتدائی نصاب اردو،مترجم مولوی سید صدر الدین رضی،ناشر حیدر رضوی اینڈ سنز تاجر کتب و ناشر،حیدر آباد دکن:نظام شاہی روڈ ،بار اول ،جنوری ۱۹۴۷ء

بچّوں کا باغ

پہلی کیاری

جماعت (الف) کے واسطے

BACHCHON KA BAGH

PAHLI KIARI

FOR

CLASS A

OF

VERNACULAR SCHOOLS FOR BOYS,

UNITED PROVINCES.

BY

RAMJI DAS BHARGAVA,
EDITOR, NEWUL KISHORE GIRLS' READERS.

LUCKNOW:
PRINTED AND PUBLISHED BY K. D. SETH,
AT THE NEWUL KISHORE PRESS.

1923.

Price 1 anna.

Science Readers for Indian Schools

INDIAN PRESS READERS

BOOK II—PART I

FOR UPPER PRIMARY SECTION—CLASS III

EDITED BY

E. G. HILL, B.A., D.Sc., F.C.S.,

PRINCIPAL, MUIR CENTRAL COLLEGE, ALLAHABAD

(APPROVED AS TEXT-BOOK BY THE EDUCATIONAL DEPARTMENT, UNITED PROVINCES)

انڈین پریس ریڈر

دوسری کتاب۔ پہلا حصہ

اپر پرائمری تیسری جماعت کے لئے

INDIAN PRESS, ALLAHABAD

1916

V013. Urdu ka Jadid Qaidah. R. Yam

جملہ حقوق محفوظ

سلسلۂ نصاب اطفال

اُردو کا جدید قاعدہ

درجۂ اطفال (مکاتب اسلامیہ) کی پہلی ششماہی کے واسطے

مرتبہ

شیخ علی جواد بی اے لکچرر مسلم یونیورسٹی اتر سیڈیٹ کالج علی گڑھ

مؤلف

علم القرآن یعنی قرآن مجید کا جدید قاعدہ۔ عقاید اسلام (برائے درجۂ اطفال)

بعد ترمیم و نظر ثانی باہتمام خانصاحب شیخ عبد اللطیف خاں

کاپیکس پریس جامع مسجد دہلی میں طبع ہوا ۱۹۳۵ء

قیمت فی جلد سوا آنہ (۱؍)

ملنے کا پتہ: شیخ علی جواد مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

چند اساطین علم کی رائیں

آنریبل جسٹس ڈاکٹر سر شاہ محمد سلیمان صاحب ایم اے ایل ایل ڈی بیرسٹرایٹ لا چیف جسٹس ہائی کورٹ الہ آباد

"اُردو کا جدید قاعدہ" اور "اردو کی جدید کتاب" مرتبہ شیخ علی جواد صاحب بی اے درجۂ اطفال کے واسطے بہترین کتابیں ہیں۔ اسباق کو آسان اور دلچسپ بنانے میں نہایت کاوش اور محنت سے کام لیا گیا ہے۔ الفاظ اور جملوں کے انتخاب نیز ان کی مثالوں سے بچوں کو بہت دلچسپی ہوگی مؤلف نے ابتدائی تعلیم کی ایک بڑی اہم خدمت انجام دی ہے کیونکہ بچوں کے لئے اچھی کتابیں کم لکھی جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مؤلف کی اس کوشش کو مدرسین قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔

ڈاکٹر محمد بدل الرحمن صاحب ایم اے پی ایچ ڈی (کیمبرج یونیورسٹی) پرنسپل اسماعیل کالج بمبئی

مجھے یہ دیکھ کر بہت مسرت ہوئی کہ شیخ علی جواد صاحب مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنا وقت اور توجہ ایسے مسئلہ کی طرف مبذول کی ہے جس پر اب تک اہل علم نے اس قدر توجہ نہیں کی جتنی کہ اس کی اہمیت متقاضی ہے یہی وجہ ہے کہ اُردو کے مروجہ قاعدے قطعی قابل اطمینان نہیں ہیں۔

مؤلف کی مرتبہ درسی کتابوں کے اصول تالیف اور طرز بیان کو دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی "اردو کا جدید قاعدہ" میری رائے میں بچوں کے لئے ایک عمدہ اور معیاری تالیف ہے اور صوری اور معنوی اعتبار سے اپنی قسم کے تمام قاعدوں میں بہترین کتاب ہے۔ "اردو کی جدید کتاب" بھی علمی اصول کے مطابق ترتیب دی گئی ہے اور میرے خیال میں اپنے مقصد تالیف کو باحسن وجوہ پورا کرتی ہے مجھے یقین ہے کہ اگر بچوں کو ان دونوں کتابوں کے ذریعہ سے اردو سکھائی گئی تو نظام تعلیم میں ایک نمایاں تغیر رونما ہوگا۔ میں نے خود اپنے بچوں کو ان کتابوں کے ذریعے سے اردو کی تعلیم دی اور نتیجہ نہایت اطمینان بخش ثابت ہوا۔ مجھے توقع ہے کہ سررشتۂ تعلیم اور مدرسین کی طرف سے مؤلف کی کافی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

[Urdu Reader]

URDU READER

FOR

PREPARATORY CLASS B

OF

VERNACULAR SCHOOLS FOR BOYS,

UNITED PROVINCES.

(Prescribed as Text-Book by the Educational Department, United Provinces.)

اُردو ریڈر

ورناکیولر مدارس کے لڑکوں کی
پریپریٹری جماعت (ب) کے واسطے

FIFTH EDITION.

(COPYRIGHT TO GOVERNMENT.)

LUCKNOW:
PRINTED AND PUBLISHED BY K. D. SETH,
AT THE NEWUL KISHORE PRESS.

1920.

Price, -/2/0 قیمت -/۱/۹

اُردو زبان کا

قاعدہ

مؤلفہٗ

خاں صاحب مولوی محمد اسمٰعیل

سابق مدرس گورنمنٹ سنٹرل نارمل اسکول آگرہ

ٹکسٹ بک

(مجوزہ)

جناب صاحب ڈائرکٹران بہادر سررشتہ تعلیم ممالک متحدہ آگرہ واودھ

وصوبہ جات بہار و اڑیسہ

باہتمام کیسری داس سیٹھ سپرنٹنڈنٹ

نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپکر شایع ہوا

۱۹۲۳ء

قیمت فی جلد ۹ پائی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

وقعہ ۲۵

کتب درسی موجودہ مطبع منشی نول کشور واقع حضرت گنج لکھنؤ

کتب تصنیف مولانا محمد اسمٰعیل صاحب

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	اُردو زبان کی پہلی کتاب	[illegible]
۲	ایضاً دوسری کتاب	[illegible]
۳	ایضاً تیسری کتاب	[illegible]
۴	ایضاً چوتھی کتاب	[illegible]
۵	ایضاً پانچویں کتاب	[illegible]
۶	ترکیب اُردو خورد قدیم	[illegible]
۷	ایضاً ایضاً جدید	[illegible]
۸	قواعد اردو کی دوسری کتاب	[illegible]
۹	ترجمان فارسی	[illegible]
۱۰	ادیب اُردو	[illegible]
۱۱	کلیات مولوی محمد اسمٰعیل مجلد	[illegible]
۱۲	کمک اُردو	[illegible]
۱۳	سفینہ اُردو	[illegible]
۱۴	سواد اُردو	[illegible]
۱۵	قواعد اردو حصہ اول	[illegible]
۱۶	آئینہ اُردو	[illegible]
۱۷	تعلیم اُردو	[illegible]

کتب مطبع منشی نول کشور لکھنؤ

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱۸	فن زراعت کی کتاب اردو	[illegible]
۱۹	مفید الانشا جدید	[illegible]
۲۰	جامیٹری متن سدہرن ونش اُردو	[illegible]
۲۱	ایضاً ایضاً ہندی	[illegible]
۲۲	اردو کاپی بک نمبر ۱ از نمبر ۲ لغایت ۷	[illegible]
۲۳	صفائی تندرستی اُردو	[illegible]
۲۴	کریم اللغات	[illegible]
۲۵	چترا گنشی جدید	[illegible]
۲۶	ہندی کاپی بک از نمبر ۱ لغایت	[illegible]
۲۷	جہانگیر کوش	[illegible]
۲۸	سری دھر کوش بلا جلد	[illegible]
۲۹	منگل کوش	[illegible]
۳۰	چندریکی کوش مجلد	[illegible]
۳۱	کاپی سفید مکمل مرتبہ بابو نولکشور بھارگو	[illegible]
	نمبر ۱ لغایت نمبر	[illegible]
۳۲	ایضاً نمبر ۲ و ۳	[illegible]
۳۳	ڈرائنگ کاپی نمبر ۱ و ۲ و ۳ و ۴	[illegible]

مینیجر مطبع منشی نول کشور لکھنؤ

۷۶۴

اُردو کی آٹھویں

منظورہ مجلس نصاب تعلیم ثانوی سرکار عالی

مطبوعۂ
صرف ٹائیل مطبع دستگیری میں طبع ہوا

بار دوم — ۱۳۵۸ف — قیمت عہ ۳ر ۴

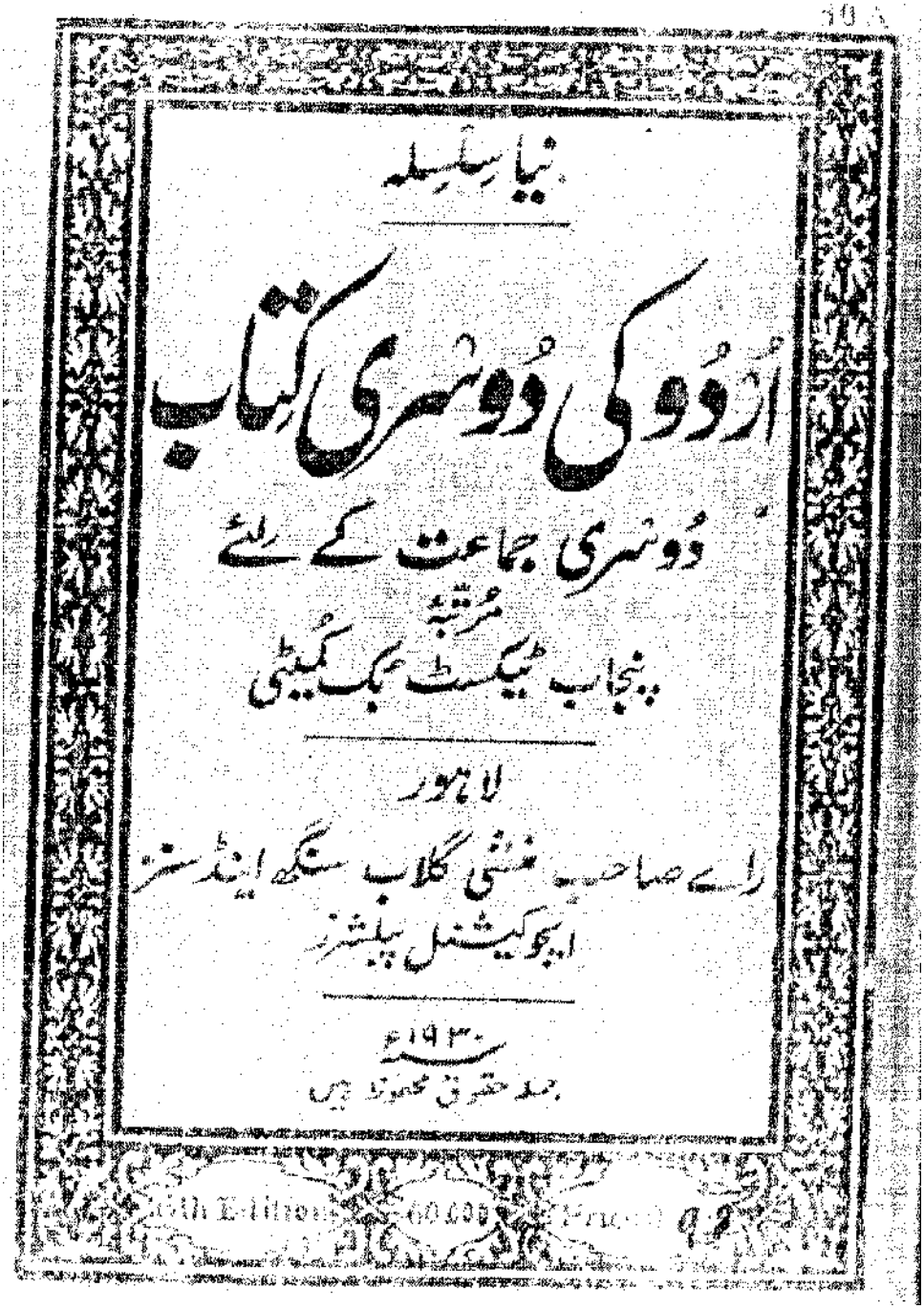

نیا سلسلہ

اُردو کی دُوسری کتاب

دُوسری جماعت کے لئے

مُرتبہ

پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی

لاہور

رائے صاحب منشی گلاب سنگھ اینڈ سنز

ایجوکیشنل پبلشرز

سنہ ۱۹۳۰ء

جملہ حقوق محفوظ ہیں

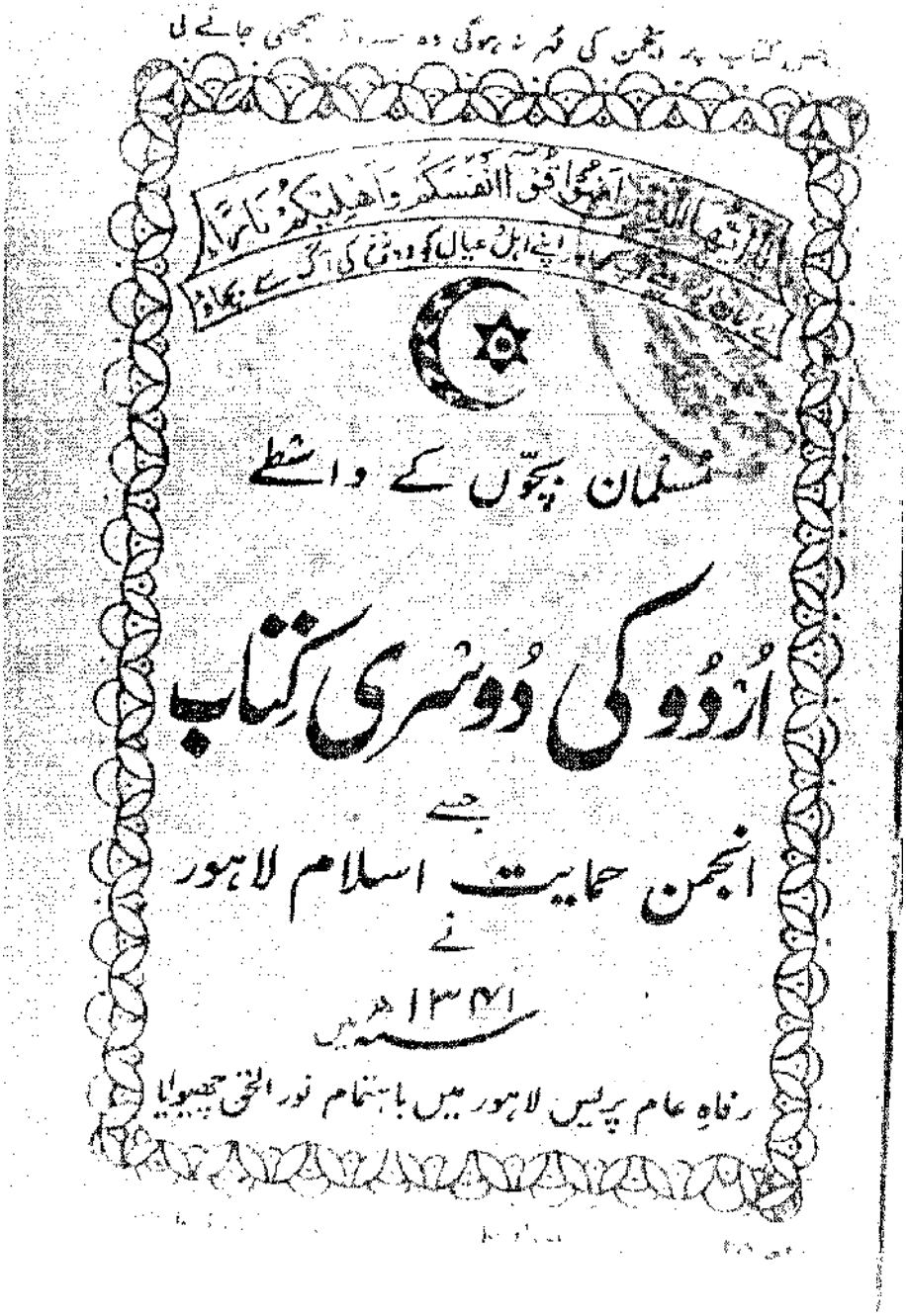

جس کتاب پر انجمن کی مہر نہ ہوگی وہ [illegible] سمجھی جائے گی

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا

اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ

مسلمان بچوں کے واسطے

اُردو کی دُوسری کتاب

جسے

انجمن حمایت اسلام لاہور

نے

سنہ ۱۳۴۱ھ میں

رفاہِ عام پریس لاہور میں باہتمام نور الحق چھپوایا

نصاب اُردو

جس کو
سینٹ پنجاب یونیورسٹی نے امتحان میٹریکولیشن
کے لئے مقرر فرمایا

سنہ ۱۹۳۰ء

پنجاب یونیورسٹی کی اجازت کے بغیر کوئی نہ چھاپے

جس کتاب پر پنجاب یونیورسٹی کی مہر
نہ ہو۔ اُس کی خریداری جائز نہیں

قیمت فی جلد دو روپے

تعداد جلد ۲۰۰۰

ڈاکٹر محمد ارشد اویسی
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، فیصل آباد

نفاذِ اُردو کے لیے قانون سازی

(۱۸۹۷ء۔۱۹۹۷ء)

The concept of a modern, democratic, independent and sovereign country is incomplete without legislature. The legislative bodies are considered important pillars of modern state system. The representative institutions of the people also protect the interests of the masses. From 1897 to 1997, the members of different Councils/Assemblies of Punjab presented bills, raised question and points of orders, moved resolutions and staged walks out for the elevation of the Urdu language and its enforcement as an official language of Pakistan. (Through) this article it is attempted to examine the 9 Bills for the enforcement of Urdu which is considered a landmark step in the history of Pakistan. The procedings of Councils/Assemblies,debates, reports of standing committees and select committees are being in this article to assesses their significance for the promotion of Urdu.

نفاذ اردو کے لیے اراکین اسمبلی نے مسوادات قانون پیش کیے، قانون سازی کے دوران میں ترامیم کے نوٹس دیے، بجٹ اردو میں پیش نہ کرنے پر احتجاج کیا، سوالات اٹھائے، قراردادیں پیش کیں، پوائنٹ آف آرڈر پر قومی زبان کی اہمیت وضرورت کی وضاحت کی، اردو سے بے اعتنائی پر احتجاجاً واک آؤٹ کیا، اردو میں ایجنڈا مہیا کرنے کا مطالبہ کیا، کورم نہ ہونے کی وجہ یہ بتائی کہ ۸۰ فیصد ارکان انگریزی نہیں سمجھتے، تحاریک التوائے کار پیش کی گئیں، اسمبلی میں اردو ذریعہ اظہار پر سپیکر کی رولنگ اور اردو کے نفاذ کے سلسلہ میں معزز اراکین اسمبلی کی طرف سے استحقاق کی تحریکیں بھی زیرِ بحث آئیں۔قومی زبان اردو کے نفاذ اور فروغ کے سلسلہ میں پنجاب اسمبلی کا یہ کردار اردو زبان کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے جس پر بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے۔

ہمیشہ سیشن میں رہنے والا وقت کا ایوان اپنی رفتار سے چلتے ہوئے منزلیں طے کرتا رہتا ہے۔فطرت کا یہ عمل بڑا پراسرار ہوتا ہے۔ اپنے حال میں مست رہنے والے انسان کو علم ہی نہیں ہوتا کہ وقت کیا فیصلے مرتب کر رہا ہے اور ایک عرصے بعد جب وقت ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہوا ایک خاص مقام پر پہنچتا ہے تو انسان ششدر رہ جاتا ہے۔۱۸۹۷ء میں جب پنجاب کے قانون ساز ادارے کا پہلا اجلاس(۱) منعقد ہوا تو کسے علم تھا کہ یہ ادارہ آگے چل کر اردو زبان کے فروغ اور نفاذ کے لیے اتنی گراں قدر خدمات انجام دے گا جو نشان راہ نہیں نشان منزل کہلائیں گی۔ یہی ہیں قدرت کی مصلحتیں جنہیں سمجھنے میں بہت دیر لگتی ہے۔

پنجاب کے لیے مقامی نمائندوں پر مشتمل قانون ساز ادارے کے تصور کی بنیاد دراصل ۱۸۵۸ء کے ملکہ برطانیہ کے اس حکم میں ہی رکھ دی گئی تھی جس کے تحت برصغیر پاک و ہند کا انتظام ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر تاج برطانیہ کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ یہ ایکٹ (قانون ہند) برصغیر میں آئینی ارتقا کا نقطہ آغاز کہا جا سکتا ہے۔ ملکہ برطانیہ کے اس حکم کی انگریزی، اردو، گورمکھی اور ہندی زبان میں نقول فراہم کرنے کے سلسلہ میں جوڈیشل کمشنر مسٹر ای تھورٹن نے نوٹس جاری کیا تھا تا کہ برصغیر میں بسنے والے ہر طبقہ کے لوگ اس کو آسانی سے سمجھ سکیں۔

''گورنمنٹ آف انڈیا کی منتقلی سے متعلق ملکہ برطانیہ اور گورنر جنرل کے اعلانات کی انگریزی، اردو، گورمکھی اور ہندی زبان میں نقول لاہور میں واقع چیف کمشنر کے دفتر سے درخواست دے کر حاصل کی جا سکتی ہے۔''(۲)

اختیارات کی منتقلی کے حوالے سے جاری ہونے والے ایک اعلان میں کہا گیا تھا۔

''ملکہ برطانیہ کے ہندوستان میں برطانوی علاقوں کی حکومت اپنے ہاتھ میں لینے پر وائسرائے اور گورنر جنرل بذریعہ تحریر ہٰذا اعلان کرتے ہیں کہ حکومت ہند کے تمام امور صرف ملکہ کے نام سے ہی انجام پائیں گے۔۔۔۔ ہر نسل اور ہر طبقے کے ایسے تمام اشخاص جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے تحت برطانیہ کی قوت و سطوت برقرار رکھنے میں شامل رہے ہیں صرف ملکہ کے ملازم شمار ہوں گے۔''(۳)

۱۸۵۸ء کے قانون ہند(۴) کے بعد حکومت ہند کی مرکزیت مکمل کر دی گئی۔ اہل ہند پر حکومت کرنے کے لیے ان کی رائے عامہ سے حکومت کو واقف ہونا چاہیے۔ اس کا تعلق رعایا کے ساتھ واضح گہرا اور پائیدار ہو جن لوگوں کے لیے حکومت قانون بنانا چاہتی تھی ان کے منشا اور خواہشوں کی اسے اطلاع ہونی چاہیے اور حکومت ہند یہ مقصد صرف اس وقت حاصل کر سکتی تھی جب قوانین بنانے کے لیے غیر سرکاری عنصر کو اپنے ساتھ شریک کرے جو جمہور کی نمائندگی کر سکے۔ یہ بات اس وقت مناسب نہیں سمجھی گئی کہ قانون بنانے کا سارا کام حسب سابق گورنر جنرل اور اس کی کونسل کے سپرد کیا جائے تا کہ ۱۸۵۸ء کے قانون ہند کے نفاذ کے بعد جو مشکلات پیدا ہوئی ہیں انہیں دور کیا جائے اور قوانین بنانے میں رائے عامہ کی خواہش کو معلوم کرنے کی تدبیر نکالی جائے۔ اس کو انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۶۱ء (قانون مجالس ہند) کہتے ہیں۔

انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۶۱ء کے ساتھ ہی کونسل کے کاروبار کو احسن طریق سے چلانے کے لیے قواعد وضع کر دیئے گئے۔ یہ قواعد انضباط کار انڈین کونسلز ایکٹ کی دفعہ ۸ کے تحت حاصل شدہ اختیارات کو بروئے کار لانے کے لیے گورنر جنرل نے وضع کیے۔ ان قواعد انضباط کار برائے کونسل میں زبان کے حوالے سے درج ذیل قاعدے دیئے گئے ہیں۔

قاعدہ نمبر ۹ کوئی رکن کسی ایسے رکن کی درخواست پر یا اس کی جانب سے بات کر سکتا ہے جو اپنا مؤقف انگریزی زبان میں بیان کرنے سے قاصر ہو۔(۵)

قاعدہ نمبر ۱۵ سیکرٹری فی الفور مسودہ قانون مع بیان اغراض وجوہ شائع کرانے کا اہتمام کرے گا اور ہر رکن کے استفادہ کے لیے اس کی نقل بھیجے گا وہ مسودہ قانون مع بیان اغراض وجوہ کو ان اراکین کے لیے جو انگریزی زبان سے ناآشنا ہیں ہندوستانی زبان میں ترجمہ کرانے کا اہتمام بھی کرے گا۔(۶)

قاعدہ نمبر ۱۷ اگر کونسل یہ فیصلہ کرے تو مسودہ قانون رپورٹ کی غرض سے ایک مجلس منتخبہ کے سپرد کیا جائے گا اور بیان اغراض وجوہ سمیت انگریزی اور ورنیکلرز بانوں میں ہندوستان کے ایسے حصوں کے سرکاری جریدوں میں شائع کرایا جائے گا جو مسودہ قانون سے متاثر ہوں۔(۷)

قاعدہ نمبر ۲۳ سیکرٹری مجالس منتخبہ کی رپورٹیں شائع کرانے کا اہتمام کرے گا اور ہر رکن کے استفادے کے لیے ان رپورٹوں کی نقول مہیا کرے گا۔ وہ ان رپورٹوں کو ان اراکین کی سہولت کے لیے ہندوستانی زبان میں ترجمہ کرانے کا اہتمام بھی کرے گا جو انگریزی زبان سے ناآشنا ہیں۔(۸)

قاعدہ نمبر ۲۵ وہ (سیکرٹری) ایسی تمام ترامیم کو ان اراکین کی سہولت کے لیے ہندوستانی زبان میں ترجمہ کرانے کا اہتمام بھی کرے گا جو انگریزی زبان سے ناواقف ہیں۔(۹)

اس کے بعد اردو کی ترویج کے لیے جو کچھ عمل میں آیا وہ حسب ذیل ہے:

لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی کونسل، انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۶۱ء ۱۸۹۲ء اور ایکٹ ۱۹۰۹ء کے تحت تشکیل پاتی رہیں۔ ۱۸۹۷ء سے ۱۹۲۰ء کے دوران میں یہ چار مختلف ادوار میں قوانین اور قواعد وضع کرتی رہیں۔ پہلا دور ۱۸۹۷ء تا ۱۹۰۹ء، دوسرا دور ۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۲ء، تیسرا دور ۱۹۱۳ء تا ۱۹۱۶ء اور چوتھا دور ۱۹۱۶ء تا ۱۹۲۰ء پر محیط ہے۔ لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کی کونسل کے یکم نومبر ۱۸۹۷ء سے ۶ اپریل ۱۹۲۰ء تک ۸۹ اجلاس منعقد ہوئے۔ ان اجلاسوں کے دوران میں مندرجہ ذیل مسودات قانون انگریزی اور اردو زبان میں پنجاب گورنمنٹ گزٹ میں اشاعت کے لیے بھیجے گئے:

1. The Punjab General Clauses Bill, 1897. (۱۰)
2. Punjab Riverain Boundaries Bill. (۱۱)
3. Punjab Land Preservation (Chos). (۱۲)
4. Punjab Limitation (Ancestral Land Alienation). (۱۳)
5. Sind Sagar Doab Colonisation. (۱۴)
6. Bill to amend Section 8 of the Punjab Laws Act. (۱۵)
7. Punjab Registration of Transport Animals Bill. (۱۶)
8. Punjab Steam Boilers and Prime Movers Bill. (۱۷)
9. Punjab Law of Pre-emption Bill. (۱۸)
10. Punjab Court of Wards Bill. (۱۹)
11. The Delhi Darbar Bill. (۲۰)

12. Punjab Loans Limitation Bill. (۲۱)

13. Law of Arbitration in the Punjab. (۲۲)

14. The Punjab Municipal Bill. (۲۳)

15. The Punjab Courts Bill. (۲۴)

16. Colonization of Government Lands (Punjab) Bill. (۲۵)

17. The Punjab Panchayat Bill. (۲۶)

18. Village Criminal Justice (Punjab) Bill. (۲۷)

19. Punjab Tenancy Act, 1887 (Amendment) Bill. (۲۸)

20. Punjab District Board (Amendment) Bill. (۲۹)

.....

پنجاب لیجسلیٹو کونسل، گورنمنٹ انڈیا ایکٹ ۱۹۱۹ء کے تحت تشکیل پائی۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۶ء کے دوران یہ اپنے فرائض انجام دیتی رہی۔ اِس کا پہلا دور ۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۳ء، دوسرا دور ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۶ء، تیسرا دور ۱۹۲۷ء تا ۱۹۳۰ء اور چوتھا دور ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۶ء پر محیط ہے۔ مجموعی طور پر پانچ سو آٹھ یوم اِس کونسل کے اجلاس منعقد ہوتے رہے صاحبِ صدر نے کونسل کے پہلے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ جو اراکین انگریزی بول چال میں روانی نہیں رکھتے وہ اپنی زبان میں کونسل سے خطاب کر سکتے ہیں۔(۳۰)

پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے ۱۶ سالہ دور میں اُردو کی ترویج و ترقی کے لیے مختلف اوقات میں کونسل کے اراکین نے آواز بلند کی۔ جب اُردو کی بات کی جاتی تو ردِّعمل میں ہندی، پنجابی اور دیگر علاقائی زبانوں کی ضرور آواز سننے میں آتی لیکن خوش قسمتی سے صرف اُردو ہی کے حوالے سے دو قرار دادیں پاس ہوئیں جو مولوی محرم علی چشتی نے پیش کی تھیں۔ ایک قرار داد ''کونسل کی کارروائی'' اُردو میں کرنے سے متعلق تھی اور دوسری قرار داد ''روداد کونسل'' کی اُردو میں اشاعت کے سلسلہ میں تھی۔

> ''کونسل کی کارروائی انگریزی میں تحریر کی جائے گی تاہم کوئی رُکن کونسل اُردو یا صوبے کی دیگر کسی علاقائی زبان میں خطاب کر سکتا ہے۔''(۳۱)

روداد کونسل کی اردو میں اشاعت کے سلسلہ میں ۲۵ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو جو تحریک صاحبِ صدر زیرِ غور لائے اِس پر ۲۶ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو رائے شماری ہوئی۔ ۱۵ ووٹ اِس قرار داد کے حق میں آئے اور ۴ ووٹ خلاف۔(۳۲)

گورنمنٹ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا درجہ بڑھا کر پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کر دیا گیا اور ساتھ ہی صدر کے عہدے کو Re-designate کر کے سپیکر کا نام دیا گیا۔ پہلی پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی ۱۹۳۶ء میں منتخب ہوئی

جب کہ دوسری ۱۹۴۶ء میں منتخب ہوئی ۔گورنمنٹ انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۸۵ اسمبلی کی زبان سے متعلق ہے جس کی رو سے اسمبلی کی تمام کارروائی انگریزی میں ہونا قرار پائی صرف ایک استثنیٰ رکھی گئی کہ ایسے ارکان جو انگریزی زبان سے واقف نہ ہوں وہ صوبہ کی مختلف زبانوں میں سے کسی زبان میں تقریر کر سکتے ہیں اِس ضمن میں ایوان کی رضا مندی سے قواعد مرتب کرنے کے لیے کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیااور یہ تجویز سامنے آئی کہ اسمبلی کی ساری کارروائی انگریزی یا ورنیکلر زبان میں سرانجام دی جائے گی۔ ورنیکلر سے مراد''اردو ، ہندوستانی اور پنجابی''(۳۳) تاہم قطعی طور پر (قاعدہ ۵۰) حسب ذیل منظور ہوا۔

''اسمبلی کی ساری کارروائی انگریزی میں سرانجام دی جائے لیکن جو ممبر اعلان کرے کہ وہ انگریزی زبان سے ناواقف ہے یا کافی واقفیت نہیں رکھتا وہ اس امر کا مجاز ہوگا کہ وہ اسمبلی کے سامنے اُردو ، پنجابی یا صاحبِ سپیکر کی اجازت سے صوبہ کی کسی دیگر مسلمہ زبان میں تقریر کرے۔''(۳۴)

.....

قیامِ پاکستان کے بعد صوبہ مغربی پنجاب کا پہلا بجٹ انگریزی زبان میں میاں ممتاز خاں دولتانہ وزیرِخزانہ نے ۶ جنوری ۱۹۴۸ء کو ایوان میں پیش کیا اس پر عام بحث اکثر و بیشتر اُردو زبان میں ہوئی بجٹ پر بحث کے دوران ہی بیگم سلمٰی تصدق حسین نے اُردو کو جلد ازجلد ذریعہ تعلیم اختیار کرنے پر زور دیا۔(۳۵) دیہی مساجد میں مکاتب کے قیام کی قرار داد اِس اسمبلی میں پیش ہوئی ۔۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء کے دوران پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی میں اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے قراردادیں منظور کی گئیں اور اُردو کے نفاذ کی بابت سوالات اُٹھائے گئے ۔(۳۶)

.....

قیامِ مغربی پاکستان ایکٹ کے تحت مغربی پاکستان لیجسلیٹو اسمبلی تشکیل پائی ۔ اِس اسمبلی میں اُردو کے حوالے سے اُٹھائے گئے بہت سے سوالات میں سے ایک یہ سوال بھی اُٹھایا گیا کہ تلاوت کی گئی قرآن پاک کی آیات اور اُس کا ترجمہ کارروائی کا حصہ بنے تو جناب سپیکر نے کہا جب قواعد میں ترمیم ہو گی تو اس وقت ایسا کر دیا جائے گا ۔(۳۷) آج تلاوت کی گئی آیات مبارکہ اور اس کا اردو ترجمہ اسمبلی کی کارروائی کا حصہ ہے ۔

.....

پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد پنجاب اسمبلی میں اور ون یونٹ کے دور میں مغربی پاکستان اسمبلی میں اردو کے نفاذ کے سلسلہ میں مختلف اوقات میں اردو سے پیار اور عقیدت رکھنے والے معزز اراکین اسمبلی نے نو مسودات قانون برائے نفاذ اردو ایوان میں پیش کیے۔ یہ پرائیویٹ بل کی صورت میں پیش کیے جاتے رہے۔اسمبلی کے مباحث گواہ ہیں کہ ان مسودات کے محرکین نے اردو کی حمایت میں بڑی پر مغز اور مدلل تقاریر کیں اور اردو کے نفاذ کے لیے ایک بھرپور مؤقف اختیار کیا۔ اردو کے لیے ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں ان کا ذکر ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

مسودات قانون برائے قومی زبان اردو:

(الف) مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۳ء

(ب) مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۵ء

(ج) مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۸ء

(د) مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۸ء

(ہ) مسودہ قانون قومی زبان پنجاب مصدرہ ۱۹۷۲ء

(و) مسودہ قانون نفاذ اردو پنجاب مصدرہ ۱۹۹۱ء

(ز) مسودہ قانون نفاذ اردو پنجاب مصدرہ ۱۹۹۱ء

(ح) مسودہ قانون نفاذ اردو پنجاب مصدرہ ۱۹۹۳ء

(ط) مسودہ قانون نفاذ اردو پنجاب ۱۹۹۷ء

سرکاری دفاتر، عدالتوں، تعلیمی اداروں اور زندگی کے دیگر شعبوں میں قومی زبان رائج کرنے کے پیش نظر پہلا مسودہ قانون برائے نفاذ اردو بعنوان ''مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۳ء'' علامہ رحمت اللہ ارشد رکن صوبائی اسمبلی نے ۲۱۔مارچ ۱۹۶۳ء کو ایوان میں پیش کیا، جسے مجلس قائمہ برائے قانون و پارلیمانی امور کے سپرد کر دیا گیا۔مجلس نے اپنے اجلاسوں میں مسودہ مذکور پر غوروخوض کیا اس مجلس کے چیئر مین خواجہ محمد صفدر تھے۔ ۲۷۔فروری ۱۹۶۳ء مجلس قائمہ کی رپورٹ ایوان میں پیش کی گئی اور اسی روز اس پر بحث کا آغاز ہوا۔ اسی رپورٹ پر ۱۸۔ مارچ ۱۹۶۴ء کو دوبارہ بحث شروع ہوئی۔ ابھی بحث جاری تھی کہ قصداً کورم توڑ دیا گیا۔حکومتی ارکان کے اس رویہ کے خلاف علامہ رحمت اللہ ارشد نے تحریک استحقاق پیش کر دی۔ اس پر بھی بحث مباحثہ ہوا۔ اس ضمن میں جناب اسپیکر نے ایک رولنگ بھی دی۔

۶۔اپریل ۱۹۶۴ء کو یہ مسودہ قانون مجلس منتخبہ (سلیکٹ کمیٹی) کے سپرد کر دیا گیا تا کہ اس پر مزید غور کیا جا سکے ۔ اس مجلس کے کئی ایک اجلاس ہوئے۔ اس مجلس کی رپورٹ یکم جولائی ۱۹۶۴ء کو ایوان میں پیش کر دی گئی لیکن بحث و مباحثہ کے بعد ایوان اسمبلی کے فیصلہ کے مطابق اس مسودہ قانون قومی زبان کو دوبارہ غور وخوض کے لیے اسی مجلس منتخبہ کو اس ہدایت کے ساتھ سپرد کیا گیا کہ وہ ۳۰۔ستمبر ۱۹۶۴ء تک اس کی رپورٹ ایوان میں پیش کر دے۔مجلس نے مقررہ تاریخ سے کئی روز پہلے اس پر ایک رپورٹ جاری کر دی جو ایوان میں پیش نہ کی جا سکی اور اسمبلی برخاست کر دی گئی۔

.....

اردو کے متوالے ہمت ہارنے والے تو نہیں ہیں اپنے اپنے محاذ پر اردو کے مجاہدین ہر ممکن صورت میں سرگرم عمل رہے کہ اردو کو بطور قومی زبان اپنا لیا جائے اس سلسلہ میں دوسرا ''مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۵ء'' خواجہ محمد صفدر نے یکم جولائی ۱۹۶۵ء کو ایوان میں پیش کیا جسے حسب معمول مجلس قائمہ برائے قانون و پارلیمانی امور کے سپرد کر دیا گیا۔ اس مجلس کی رپورٹ پر ۵۔دسمبر ۱۹۶۶ء اور پھر ۵۔جون ۱۹۶۷ء کو طویل بحث ہوئی۔ اس کی افادیت اور اہمیت پر بحث کے بعد رائے شماری

(ووٹنگ) ہوئی تو اس مسودہ قانون کو مسترد کر دیا گیا۔

علامہ رحمت اللہ ارشد کی جانب سے پیش کیا جانے والا مسودہ قانون تاخیری حربوں کی نذر ہو گیا اور خواجہ محمد صفدر کی طرف سے پیش کیا جانے والا مسودہ قانون حکومتی اکثریت کے سامنے بے بس ہو گیا لیکن اردو کے خادم تو پر عزم ہیں حوصلے والے ہیں مسلسل کوشش میں رہے ۔ تیسری بار ملک محمد اختر نے ۲۔جولائی ۱۹۶۸ء کو'' مسودہ قانون زبان مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۸ء'' ایوان میں پیش کیا جسے پہلے ہی مرحلے پر ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک صاحب نے ہمت نہ ہاری انہوں نے ۱۶۔جنوری ۱۹۶۹ء کو دوبارہ (چوتھی بار) مسودہ قانون برائے نفاذ اردو ایوان میں پیش کر دیا لیکن یہ کوشش بھی بارآور نہ ہوئی۔ اسمبلی برخاست کر دی گئی اور ون یونٹ بھی توڑ دیا گیا۔

اردو کے نفاذ کے لیے پانچویں دفعہ سید تابش الوری نے ''مسودہ قانون قومی زبان پنجاب مصدرہ ۱۹۷۲ء'' ۷۔جولائی ۱۹۷۲ء کو ایوان میں پیش کیا۔ اس پر مجلس قائمہ کی رپورٹ ۲۵۔جنوری ۱۹۷۳ء کو پیش کی گئی ۔حکومت کو یقین دہانی کی بنا پر اس مسودہ قانون پر مزید کارروائی نہ ہوئی۔

۱۹۷۲ء کے بعد ۱۹۹۱ء میں (چھٹی بار) جناب ارشاد حسین سیٹھی ' جناب فرید احمد پراچہ اور میاں محمود الرشید نے ''مسودہ قانون نفاذ اردو پنجاب مصدرہ ۱۹۹۱ء'' پیش کیا۔ اسی سال (۱۹۹۱ء) میں (ساتویں بار) میاں محمود الرشید نے دوبارہ نفاذ اردو بل پیش کیا۔ اس سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے ایک بار پھر (آٹھویں بار) سید تابش الوری نے نفاذ اردو بل ۱۹۹۳ء پیش کیا اور ۱۹۹۷ء میں (نویں بار) مولانا منظور احمد چنیوٹی نے ''مسودہ قانون نفاذ اردو پنجاب بابت ۱۹۹۷ء'' پنجاب اسمبلی میں جمع کروا دیا۔

اگرچہ ان تمام مسودات قانون برائے نفاذ اردو میں سے کوئی بھی باقاعدہ قانون کی صورت اختیار نہ کر سکا لیکن اس کے باوجود اس ضمن میں کی جانے والی کوششوں کو اردو زبان کی ترویج و ترقی میں نمایاں مقام حاصل رہے گا اور یہ کوششیں انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گی۔ضروری سمجھتا ہوں کہ ان تمام مسودات قانون برائے نفاذ اردو کا الگ الگ جائزہ لے لیا جائے۔

☆ مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۳ء (مسودہ قانون نمبر ۱۲ بابت ۱۹۶۳ء)

منجانب علامہ رحمت اللہ ارشد' رکن اسمبلی

☆ مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۳ء (مسودہ قانون نمبر ۱۳ بابت ۱۹۶۳ء)

منجانب: مولانا غلام غوث' رکن اسمبلی

☆ مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۳ء (مسودہ قانون ۱۴ بابت ۱۹۶۳ء)

منجانب: چودھری گل نواز خاں' رکن اسمبلی

مندرجہ بالا تین مسودات قانون برائے قومی زبان صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان سیکرٹریٹ میں جمع کروائے گئے۔ ان میں سے قرعہ علامہ رحمت اللہ ارشد کے نام کا نکلا لہٰذا علامہ صاحب نے ایوان میں یہ مسودہ قانون پیش کیا۔علامہ رحمت اللہ ارشد کے پیش کیے گئے مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۳ء کے ''بیان اغراض و وجوہ'' میں کہا گیا:

''مسلمان برطانوی عہد سے اردو زبان کو برقرار رکھنے کے لیے جدوجہد کرتے چلے آئے ہیں اور ماضی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین گائے کی تقدیس اور زبان کے مسئلے پر فرقہ وارانہ فسادات اور خون خرابہ ہوتا رہا ہے ۔ اردو ملک کی قومی زبان تسلیم کی گئی ہے اور ملک میں ہر شخص کو اس زبان سے انس ہے۔ تعلیمی اداروں میں طلبا اور اساتذہ اس زبان کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ عدالتوں میں مدعی و مدعا علیہ ، مقدمہ باز اور ملزم ، وکیل اور موکل گواہ اور جج سب پاکستانی ہیں۔ ملک کے موجودہ حالات میں ایک غیر ملکی زبان کی حوصلہ افزائی اور سرپرستی خلاف مصلحت ہے نیز یہ امر کہ تمام سرکاری کارروائی انگریزی میں کی جا رہی ہے ۔ عوام کے لیے بہت دقت اور تکلیف کا باعث ہے ہمارے تعلیمی اداروں میں انگریزی کا ذریعہ تعلیم ہونا وطن دشمن احساسات کا مظہر اور تضیع اوقات کے مترادف ہے اور سرکاری کارروائی و امور کی انجام دہی میں غیر ضروری طوالت کا باعث ہے۔ یہ پاکستان کے خصوصی مفادات کے عین منافی ہے۔ اس مسودہ قانون کا منشا مذکورہ مشکلات کو دور کرنا ہے ۔ **(۳۸)**

علامہ رحمت اللہ ارشد نے اس مسودہ قانون The west Pakistan National Language Bill 1963 کو ایوان میں پیش کرنے کی اجازت چاہی تو وزیر ریلوے (مسٹر عبدالوحید خاں) نے اس حوالے سے کہا کہ صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ اگر علامہ صاحب اس میں نیشنل کی بجائے Official کر دیں تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا کیونکہ اس Constitution سے کوئی Conflict نہیں آئے گا اگر ایسا کر دیں تو میں اس کو Oppose نہیں کروں گا کیونکہ Constitution کے آرٹیکل نمبر ۲۱۵ میں نیشنل Language جو ہے اسے Official Language لکھا ہے۔محرک نے اس ترمیم سے اتفاق کیا۔ ایوان میں پیش کیے جانے کے بعد اس مسودہ قانون کو مجلس قائمہ برائے قانون و پارلیمانی امور کے سپرد کر دیا گیا ۔ **(۳۹)** مجلس قائمہ نے اپنے اجلاس جو ۲۴ ستمبر ۱۹۶۳ء ، ۲۳ جنوری ۱۹۶۴ء اور ۱۰۔۱۱ فروری ۱۹۶۴ء کو عمارت اسمبلی میں منعقد کیے گئے تھے مسودہ قانون مذکورہ پر غور وخوض کیا اس مجلس قائمہ کی رپورٹ علامہ رحمت اللہ ارشد نے ایوان میں پیش کی کہ مجلس قائمہ نے اس کی سفارش کی ہے فی الفور زیر بحث لایا جائے ۔ **(۴۰)**

جناب سینئر ڈپٹی سپیکر نے اس تحریک کو ایوان کے سامنے رکھا تو وزیر تعلیم میاں محمد حسین وٹو نے اس کی مخالفت کی ۔ **(۴۱)** حکومت کی طرف سے مخالفت کے بعد اس مسودہ قانون پر بحث کا آغاز علامہ رحمت اللہ ارشد نے کیا اس بحث میں محرک کے علاوہ سردار عنائیت اللہ حسن خاں عباسی، صاحبزادی محمودہ بیگم ، امیر حبیب اللہ خاں سعدی ، میاں محمد اکبر، مولانا غلام غوث ، مسٹر منور خاں، بیگم جہاں آرا شاہنواز ، خواجہ محمد صفدر، مسٹر مبین الحق صدیقی ، خاں ملنگ خاں، مسٹر ایس ایم سہیل ، مسٹر عبدالرزاق خاں، چودھری سعی محمد، حاجی میر محمد بخش، خاں اجون خاں جدون ، مسٹر افتخار احمد خاں پارلیمانی سیکرٹری ، میاں محمد شریف ، راؤ خورشید علی خاں، مسٹر حمزہ ، سید احمد سعید کرمانی ، حاجی گل حسن منگھی اور وزیر تعلیم نے اس میں حصہ لیا ۔ علامہ رحمت اللہ ارشد نے اپنے پیش کردہ بل کے حق میں دلائل دیتے ہوئے کہا کہ ایک آزاد خود مختار با غیرت اور باہمت قوم کا سب سے پہلا فرض اور سب سے اہم فرض یہ ہے کہ اس

کی اپنی قومی زبان ہو اور وہ قومی زبان تمام عوامل کی حامل ہو ۔ علامہ صاحب نے مزید کہا کہ اس بل کو ملک کے عمائدین کے پاس رائے معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا ۔ پشاور یونیورسٹی ، حیدر آباد یونیورسٹی ،کراچی یونیورسٹی ، پنجاب یونیورسٹی اس کے علاوہ تمام ڈویژن کے کمشنروں ،پروفیسروں اور دانشوروں کی آرا بھی میرے پاس ہیں جنہوں نے اس کے ساتھ اصولاً اتفاق کیا (اس مسودہ قانون کو رائے عامہ کے لیے مشتہر کیا گیا ۔ ڈویژنل کمشنروں اور مختلف یونیورسٹیوں کی اردو بل کے حق میں رپورٹ موصول ہوئیں ان تمام کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنی تصنیف ''پاکستان میں اردو کا مسئلہ'' مکتبہ خیابان ادب لاہور ۱۹۷۶ء میں شامل کیا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس تصنیف کو ادارہ فروغ قومی زبان نے ''تحریک نفاذ اردو'' کے نام سے شائع کیا ۔) اردو کے عدالتی زبان ہونے کے حوالے سے کہا کہ ملک کے سب سے بڑے جیورسٹ اور ملک کی سب سے بڑی عدالت کے عہدے دار جسٹس اے آر کارنیلیس نے اردو ڈائجسٹ لاہور کے نامہ نگار کو انٹرویو دیا تھا اس میں (جسٹس اے آر کارنیلس سے انٹرویو الطاف حسین قریشی نے کیا جو اردو ڈائجسٹ لاہور کی جنوری ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔)وہ فرماتے ہیں کہ آپ کے نظام تعلیم میں بنیادی نقص یہ ہے کہ اب بھی اردو زبان کو ثانوی حیثیت حاصل ہے ۔ اور کہا کہ اعلیٰ عدالتوں میں اردو زبان کو رائج کیا جا سکتا ہے صاحبزادی محمودہ بیگم نے اردو بل کے حق میں دلائل جاری رکھتے ہوئے کہا کہ یہ آپ نے حال میں دیکھا ہو گا کہ چین کے وزیر اعظم جب یہاں تشریف لائے ۔ **(۴۲)**تو میری ذاتی رائے (چین کے وزیر اعظم جناب چو این لائی نے مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۶۴ء کو مغربی پاکستان اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کیا) ہے اور میں نے لوگوں سے بھی معلوم کیا ہے کہ وہ اچھی خاصی انگریزی جانتے ہیں لیکن انہوں نے پاکستان کے قیام کے تمام عرصہ میں ایک لفظ بھی انگریزی کا استعمال نہیں کیا اور میں سمجھتی ہوں کہ یہی زندہ قوموں کی دلیل ہے ۔مجلس قائمہ کی رپورٹ پر دوبارہ بحث کا آغاز ۱۸ مارچ ۱۹۶۴ء کو ہوا ابھی بحث جاری تھی کہ قصداً کورم توڑ دیا گیا۔**(۴۳)** کورم نہ ہونے کی وجہ سے اجلاس ۱۹ مارچ ۱۹۶۴ء صبح نو بجے تک ملتوی کر دیا گیا ۔ **(۴۴)**علامہ رحمت ارشد نے مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان پر بحث کے دوران میں کورم توڑے جانے کے حوالے سے تحریک استحقاق پیش کی اور کہا کہ حکومت نے میرے غیر سرکاری بل قومی زبان کے پاس ہونے میں دانستہ رکاوٹ پیدا کی اور بعض وزرا غیر پارلیمانی پریکٹس کے ذریعے نہایت ہی ناپسندیدہ انداز سے ایوان کا کورم توڑ کر قومی زبان ایسے مسئلہ پر ایوان کو فیصلہ دینے میں رکاوٹ ثابت ہوئے۔**(۴۵)** علامہ صاحب نے روزنامہ امروز لاہور مورخہ ۱۹ مارچ ۱۹۶۴ء کو بھی پیش کیا جس کے صفحہ ۴ پر خرامہ کے عنوان سے کارروائی ملاحظہ کی جا سکتی ہے ۔ انہوں نے مزید کہا کہ مسٹر غلام نبی میمن وزیر قانون کے اس طریق کار پارلیمانی سیکرٹریوں کی اس سرگرمی سے ایوان کا وقار بری طرح مجروح ہوا ہے اور شدید قسم کی استحقاق شکنی ہوئی ہے ۔ جناب سپیکر نے ۲۶ مارچ ۱۹۶۴ء کو رولنگ دیتے ہوئے اس تحریک استحقاق کو آؤٹ آف آرڈر قرار دے دیا (تفصیل کے لیے دیکھیے معیار- ۸، شعبہ اردو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد،۲۰۱۲ء،ص ۸۵۔۱۱۸)

مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۳ء پر تیسری بار بحث کے آغاز ہی میں پارلیمانی سیکرٹری چودھری امتیاز علی گل نے یہ تحریک پیش کی کہ مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۳ء کو جیسا کہ اس کے بارہ میں مجلس قائمہ برائے

قانون و پارلیمانی امور نے سفارش کی ہے مجلس منتخبہ (سلیکٹ کمیٹی) کے سپرد کیا جائے مجلس منتخبہ کے اراکین کی تعداد ۱۳ تھی اور مجلس کو ہدایت کی گئی کہ وہ ۳۰ جون ۱۹۶۴ء تک اپنی رپورٹ پیش کر دے۔ (۴۶) کمیٹی نے مسودہ قانون پر اپنے اجلاس منعقدہ ۱۸ مئی ۱۹۶۴ء، ۹ جون ۱۹۶۴ء اور ۲۶ جون ۱۹۶۴ء میں غور وخوض کیا۔ سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ ایوان کی طرف سے مقرر کردہ وقت سے کئی روز پہلے جاری کر دی گئی یکم جولائی ۱۹۶۴ء کو یہ رپورٹ غور وخوض کے لیے ایوان کے سامنے رکھی گئی ابھی بحث کا آغاز نہیں ہوا تھا کہ وزیر قانون نے یہ تحریک پیش کی اس مسودہ قانون کی دوبارہ اسی مجلس کے سپرد کرایا جائے تاکہ وہ مسودہ قانون کے نفاذ پر انگریزی سے اردو کی تبدیلی کے سلسلہ میں آنے والے اخراجات اور صوبہ کے مختلف محکموں اور اداروں کو اس پر موثر طور پر اور پوری طرح عمل درآمد کرنے کے لیے جو وقت درکار ہو گا ان سب کی تفصیلات معلوم کرے۔ (۴۷) وزیر تعلیم کی طرف سے پیش کی گئی ترمیم پر علامہ رحمت اللہ ارشد نے کہا کہ اردو زبان کا بل اس Ruling Party کے حلق میں اٹکا ہوا ہے نہ یہ اسے اُگل سکتی ہے اور نہ ہی نوکر شاہی نے اسے ہضم کرنے دیا۔ بہرحال یہ مسودہ قانون دوبارہ مجلس منتخبہ کو اس ہدایت کے ساتھ سپرد کیا گیا کہ ۳۰ ستمبر ۱۹۶۴ء تک اس کی رپورٹ پیش کر دی جائے۔ (۴۸) لیکن اس بار یہ رپورٹ ایوان میں پیش نہ کی جا سکی کیونکہ اسمبلی برخاست کر دی گئی تھی (اس اسمبلی کا آخری اجلاس ۳ جولائی ۱۹۶۴ء کو منعقد ہوا۔)

نئی اسمبلی وجود میں آئی تو ایک بار پھر اردو کے چاہنے والے میدان عمل میں سرگرم ہو گئے اور خواجہ محمد صفدر نے (دوسری بار) مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۵ء میں پیش کیا۔ (۴۹) جس پر مجلس قائمہ نے اپنے اجلاس ۷ اگست، ۱۱ نومبر ۱۲ نومبر ۱۹۶۵ء میں مسودہ قانون پر غور وخوض کیا۔ مجلس قائمہ کی رپورٹ خواجہ محمد صفدر نے ایوان میں ابھی پیش کی ہی تھی کہ پارلیمانی سیکرٹری سردار محمد اشرف نے یہ ترمیم پیش کر دی کہ مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان ۱۹۶۵ء جس کی مجلس قائمہ برائے قانون و پارلیمانی امور نے سفارش کی ہے کو مجلس منتخبہ کے سپرد کر دیا جائے۔ (۵۰) ۵ دسمبر ۱۹۶۶ء کے بعد ۵ جون ۱۹۶۷ء کو مجلس قائمہ کی رپورٹ دوبارہ ایوان میں بحث کے لیے پیش کی گئی تو اس پر بحث کا آغاز ملک محمد اختر نے کیا۔ قائد ایوان اور قائد حزب اختلاف کی تقاریر کے بعد جناب سپیکر نے یہ سوال اسمبلی کے سامنے رکھا کہ مسودہ قانون مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۵ء جیسا کہ اس پر مجلس قائمہ برائے قانون و پارلیمانی امور نے سفارش کی پر فوری غور وخوض کیا جائے، جناب سپیکر نے کہا جو اس کے حق میں ہیں۔ ''ہاں'' کہیں تو اردو بل کی حمایت کرنے والوں نے ''ہاں'' کہا اور جب جناب سپیکر نے کہا کہ جو اس کے مخالف ہیں ''نہ'' کہیں تو اس طرح ''نہ'' کہنے والوں کی آوازیں آئیں اور جناب سپیکر نے فیصلہ دیا کہ فیصلہ ''نہ'' والوں کے حق میں ہے اس فیصلہ کو خواجہ محمد صفدر نے چیلنج کیا اور درخواست کی کہ بہت اہم مسودہ قانون ہے لہٰذا ڈویژن کروائی جائے۔ ڈویژن کرائی گئی تو ڈویژن کے نتائج اس طرح سے تھے۔ حق میں ۵ ووٹ مخالفت میں ۶۳ ووٹ۔ (۵۱)

تیسری دفعہ ملک محمد اختر نے مسودہ قانون مغربی پاکستان مصدرہ ۱۹۶۸ء پیش کرتے ہوئے موقف اختیار کیا کہ اردو تمام سرکاری اور نیم سرکاری اور روزمرہ کے کاموں میں انگریزی کی جگہ لے۔ اس مسودہ قانون کو پیش کرنے کی اجازت کے سوال پر اس

کے حق میں ۴ ووٹ اور ۲۸ ووٹ مخالفت میں آئے۔ (۵۲) لہٰذا یہ مسودہ قانون مغربی پاکستان ۱۹۶۸ء بھی سرکاری اکثریت کی نذر ہو گیا۔ نفاذ اردو کے لیے اردو کے خادم مسلسل سرگرم عمل رہے اور ملک محمد اختر نے چھ ماہ بعد (چوتھی بار) مسودہ قانون قومی زبان مغربی پاکستان ۱۹۶۸ء اسمبلی میں پیش کر دیا۔ (۵۳) اور بھرپور دلائل دیے۔ جناب سپیکر نے جب یہ بل پیش کرنے کی اجازت کا سوال ایوان کے سامنے رکھا تو یہ تحریک مسترد کر دی گئی۔ (۵۴)

پانچویں دفعہ اردو کے نفاذ کے لیے سید تابش الوری نے مسودہ قانون قومی زبان پنجاب مصدرہ ۱۹۷۲ء ایوان میں پیش کیا۔ (۵۵) جسے مجلس قائمہ برائے اطلاعات کے سپرد کر دیا گیا۔ مجلس قائمہ برائے اطلاعات نے اپنے اجلاس منعقدہ ۲۸ اگست، ۲۵ ستمبر اور ۱۶/اکتوبر ۱۹۷۲ء میں اس مسودہ قانون پر غور و خوض کیا۔ (۵۶) اور اس کی رپورٹ ملک محمد خالد نے ایوان میں پیش کی۔ (۵۷) اس کے بعد اسمبلی کے کارروائیوں میں اس بل کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملتی کہ اس بل کے ساتھ کیا سلوک ہوا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''عوامی حکومت کے دور میں سید تابش الوری نے بھی پنجاب اسمبلی میں بل کا نوٹس دیا لیکن پھر پیچھا نہیں کیا کیونکہ گورنر پنجاب نے دفتری زبان کا اعلان کر دیا تھا۔'' (۵۸)

چھٹی بار، مسودہ قانون نفاذ اردو پنجاب مصدرہ ۱۹۹۱ء جناب ارشاد حسین سیٹھی، جناب فرید احمد پراچہ اور میاں محمود الرشید نے پیش کیا۔ (۵۹) حکومت کی طرف سے یقین دہانی پر اس بل پر زور نہ دیا گیا اور یہ بل Dispose of کر دیا گیا۔ (۶۰)

(ساتویں بار) میاں محمود الرشید نے مسودہ قانون نفاذ اردو پنجاب مصدرہ ۱۹۹۱ء پیش کیا۔ جناب ڈپٹی سپیکر نے جب ایوان کے سامنے یہ سوال رکھا کہ نفاذ اردو پنجاب ۱۹۹۱ء پیش کرنے کی اجازت دی جائے جو اس تحریک کے حق میں ہیں وہ ''ہاں'' کہیں اور جو خلاف ہیں وہ ''نہ'' کہیں۔ تحریک نامنظور ہوئی۔ (۶۱) اس مرحلہ پر میاں محمود الرشید ایوان سے واک آؤٹ کر گئے۔

بعدازاں ۱۹۹۳ء میں سید تابش الوری نے اور ۱۹۹۷ء میں مولانا منظور احمد چنیوٹی نے نفاذ اردو بل پنجاب اسمبلی سیکرٹریٹ میں جمع کرائے۔ (آٹھویں بار) سید تابش الوری کے پیش کیے گئے مسودہ وقانون نفاذ اردو پنجاب بابت ۱۹۹۳ء کے بیان اغراض و جود میں کہا گیا:۔

> ''پاکستان کے تینوں دستاویز میں اردو کو قومی زبان قرار دیا گیا ہے۔ قومی تشخص اور حب الوطنی کا تقاضا ہے کہ قومی زبان کو سرکاری زبان بنایا جائے۔ دستور ۱۹۷۳ء کے آرٹیکل ۲۵۱ کے مطابق ۱۴/اگست ۱۹۸۸ء تک سرکاری دفاتر، عدالتوں، تعلیمی اداروں، امتحانات، مقابلہ اور سرکاری گزٹ میں انگریزی کی جگہ اردو رائج ہونی چاہیے تھی قائداعظم کے فرامین مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۴۶ء، ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء، ۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء کی رو سے اردو کو سرکاری زبان بننا چاہیے انگریزی کے ساتھ فرنگی تہذیب وابستہ ہے اردو اسلامی تہذیب و تمدن کی آئینہ دار ہے نفاذ اردو سے قومی یک جہتی کو

فروغ ہوگا۔ مقتدرہ قومی زبان نے نفاذ اردو کے مکمل انتظامات کر لیے ہیں اردو ذریعہ تعلیم سے طلبہ کی تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہوں گی ۔ روس ، چین ، جاپان ، کوریا ، جرمنی و فرانس نے سائنس انگریزی میں نہیں بلکہ اپنی قومی زبانوں میں پڑھی لہٰذا ترقی کر گئے ملکی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ سائنس قومی زبان میں پڑھی جائے ۔ لازمی انگریزی کی وجہ سے محض انگریزی میں فیل ہونے کی وجہ سے ساٹھ فیصد طلبا امتحان میں ناکام ہو جاتے ہیں اردو ہر جگہ سمجھی جاتی ہے اور بین الصوبائی رابطہ کی زبان ہے جب کہ آدھے فیصد سے بھی کم ملکی آبادی انگریزی سمجھتی ہے اردو دُنیا کی تیسری بڑی بولی اور سمجھی جانے والی انتہائی ترقی یافتہ بین الاقوامی زبان ہے ۔ پاکستان میں میٹرک تک اردو یا صوبائی زبان ذریعہ تعلیم طلبا کا تناسب تقریباً ۹۸ فیصد ہے ۔انگریزی ذریعہ تعلیم سے متعلق طلبا کا تناسب تقریباًدو فیصد ہے۔ امتحانات مقابلہ میں انگریزی ذریعہ اظہار و ذریعہ گفتگو کی وجہ سے دو فیصد کی حقیر اقلیت کی اعلیٰ حکومتی اسامیوں پر ۱۹۴۷ء سے مسلسل اجارہ داری ہے جو آئین ۱۹۷۳ء کے آرٹیکل نمبر ۲ الف اور ۳ کی روح اور منشا کے منافی ہے۔ **(۶۲)**

(نویں بار) مولانا منظور احمد چنیوٹی نے بل برائے نفاذ اُردو بابت ۱۹۹۷ء کے ابتدائیہ میں تحریر کیا۔'' ہر گاہ کہ پاکستان کی خالق جماعت آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ بتاریخ ۱۵ تا ۱۷۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ایک قرار داد کے ذریعے برطانوی حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ تمام سرکاری دفاتر ، عدالتوں ، اسمبلیوں ، ریلوے اور محکمہ ڈاک میں انگریزی کی جگہ اردو کو رائج کیا جائے ۔ نیز اپنے سالانہ اجلاسوں منعقدہ امرتسر ، دہلی ، ناگپور ،لکھنؤ ، کلکتہ ، امرتسر ،علی گڑھ و پٹنہ بتاریخ ۳۰۔۳۱ دسمبر ۱۹۰۸ء ۲۹۔۳۰ جنوری ۱۹۱۰ء ، ۲۸ تا ۳۰ دسمبر ۱۹۱۰ء ۳۰۔ ۳۱ دسمبر ۱۹۱۶ء ۳۰ دسمبر ۱۹۱۷ء تا یکم جنوری ۱۹۱۸، ۲۹ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۱۹ء ، ۳۰۔۳۱ دسمبر ۱۹۲۵ء ، ۲۶ تا ۲۸ دسمبر ۱۹۳۸ء بالترتیب میں اُردو کے حق میں قرار دادیں منظور کی تھیں ۔

ہر گاہ کہ قائداعظم نے ۱۹۴۲ء میں کتاب ''مسلم انڈیا پاکستان'' کے دیباچہ میں تحریر فرمایا تھا۔

'' پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہو گی ۔''

ہر گاہ کہ قائداعظم نے ۱۰ ۔اپریل ۱۹۴۶ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ دہلی میں فرمایا تھا۔

''میں اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہو گی ۔''

ہر گاہ کہ قائداعظم نے بتاریخ ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء ڈھاکہ کے ایک بڑے جلسہ عام میں اعلان فرمایا تھا ۔

'' پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہو گی اور صرف اُردو ، اُردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں ۔''

ہر گاہ کہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں ۲۴ ۔ مارچ ۱۹۴۸ء کو قائداعظم نے ببانگ دہل اعلان فرمایا تھا۔

'' پاکستان کی سرکاری زبان صرف ایک ہی ہوسکتی ہے اور وہ اُردو ہے ۔ اُردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں ۔''

مارچ ۱۹۴۸ء میں قائداعظم پاکستان کے گورنر جنرل تھے۔

ہر گاہ کہ ۱۹۶۳ء میں خواجہ محمد صفدر نے مغربی پاکستان اسمبلی میں اُردو بل پیش کیا تھا ۔ سارے مغربی پاکستان (اب پاکستان) کے کمشنروں اور دوسرے اہل الرائے حضرات سے استصواب کیا گیا کہ ۔

'' کیا اُردو دفاتر ،تعلیمی اداروں و عدالتوں کی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے؟''

۹۹ فیصد جواب'' ہاں'' تھا ۔ سندھ و سرحد سے بھی جواب ملا کہ اُردو کامیاب ہی نہیں بلکہ انگریزی کے مقابلہ میں زیادہ موثر زبان ہے ۔

ہر گاہ کہ دستور اسلامی جمہوریہ پاکستان ۱۹۷۳ء کے آرٹیکل ۲۵۱ (۱) کی رو سے تاریخ آغاز سے پندرہ سال کے اندر اُردو کو سرکاری و دیگر مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا اہتمام ضروری قرار دیا گیا تھا ۔ یہ میعاد ۱۴۔ اگست ۱۹۸۸ء کو پوری ہو گئی تھی۔ اس تاریخ کے بعد اس معاملہ میں تعطل یا التواء کی کوئی گنجائش موجود نہیں۔''**(۶۳)**

اردو کو اس کا مقام دلانے کے سلسلے اردو کے خادمین اردو کی ترقی کے لیے انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر مسلسل کوشش میں رہے ان کی کوششوں میں کبھی بھی کمی نہ آئی ۔ اردو کی قدرومنزلت سے آگاہ دوسروں کو بھی آگاہ کرتے رہے کہ کسی قوم کی پہچان اس کی اپنی زبان میں ہوتی ہے دوسروں کی زبان میں نہیں۔ ۱۸۹۷ء میں اپنا ارتقائی سفر شروع کرنے والا قانون ساز ادارہ(پنجاب اسمبلی)علم و ادب کے کئی پہلو اپنے اندر محفوظ کیے ہوئے ہے ۔ دستوری تحفظات کے باوجود خدشات اپنی جگہ موجود رہے اور نفاذ اردو کی راہ میں ہر گام پر ایک نئی رکاوٹ سر اٹھائے کھڑی تھی اس کے باوجود اردو نے اپنا سفر جاری و ساری رکھا۔ اور محبان اردو کی بدولت آج اردو زبان پاکستان کے قانون ساز اداروں میں شان و شوکت کے ساتھ جلوہ افروز ہے ۔ سینٹ آف پاکستان ، قومی اسمبلی پاکستان ، چاروں صوبائی اسمبلیوں اور قانون ساز اسمبلی آزاد جموں کشمیر کے قواعد و انضباط کار میں واضح طور پر تحریر ہے کہ اراکین اسمبلی عام طور پر اردو میں خطاب کریں گے اگر وہ اپنا مافی الضمیر تسلی بخش طور پر ادا نہ کر سکے تو وہ چیئر مین/ سپیکر کی اجازت سے انگریزی یا صوبے کی دیگر تسلیم شدہ زبان میں اسمبلی سے خطاب کر سکتا ہے ۔ نومبر ۱۸۹۷ء سے آج تک اراکین کی طرف سے اٹھائے گئے اقدامات اور ان اراکین کی جانب سے اسمبلی سے مخصوص ٹرمینالوجی کو اردو کے لیے بروئے کار لانا ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں ۔ نفاذ اردو کے لیے پنجاب اسمبلی میں اٹھائے گئے یہ اقدامات ایک مسلمہ تاریخی اہمیت رکھتے ہیں یہ اردو زبان کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے جس پہ بجا طور پر فخر کیا جا سکتا ہے ۔ آج تلاوت کی گئی آیات مبارکہ اور اس کا ترجمہ مباحث پنجاب اسمبلی کا حصہ ہے ۔

حوالہ جات

۱۔ مباحث، کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب، یکم نومبر ۱۸۹۷ء، ص ۱

۲۔ پنجاب گزٹ ،۳ ۔نومبر ۱۸۵۸ء ،جلد دوم، ص ۳۱۲

۳۔ پنجاب گزٹ (ضمیمہ)،۳۔نومبر ۱۸۵۸ء،ص ۲

۴۔ V.P.Menon, The Transfer of Power in India, Songom Books, New Delhi, 1957, P-3

۵۔ انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۶۱،ص ۳۴ (قواعد انضباطِ کار)

۶۔ انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۶۱،ص ۳۵۔۳۶، (قواعد انضباط کار)

۷۔ انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۶۱،ص ۳۶۔۳۷، (قواعد انضباط کار)

۸۔ انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۶۱،ص ۳۶۔۳۷، (قواعد انضباط کار)

۹۔ انڈین کونسلز ایکٹ ۱۸۶۱،ص ۳۶۔۳۷، (قواعد انضباط کار)

۱۰۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب، یکم نومبر ۱۸۹۷،ص ۴

۱۱۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب، یکم نومبر ۱۸۹۸،ص ۷

۱۲۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب، ۱۶۔اگست ۱۸۹۹،ص ۱۷

۱۳۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب، ۱۶۔اگست ۱۸۹۹،ص ۲۱

۱۴۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۲۔نومبر ۱۸۹۹،ص ۳۰

۱۵۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۱۴۔جولائی ۱۹۰۰،ص ۲۱

۱۶۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۱۷۔جنوری ۱۹۰۲،ص ۶

۱۷۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۱۷۔جنوری ۱۹۰۲،ص ۷

۱۸۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۱۷۔جنوری ۱۹۰۲،ص ۱۰

۱۹۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۱۰۔نومبر ۱۹۰۲،ص ۷

۲۰۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۱۰۔نومبر ۱۹۰۲،ص ۸

۲۱۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۲۵۔اپریل ۱۹۰۴ء،ص ۲

۲۲۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۱۲۔مارچ ۱۹۱۰،ص ۳

۲۳۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۲۲۔اگست ۱۹۱۰،ص ۶۱

۲۴۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۱۶۔دسمبر ۱۹۱۰،ص ۷۲

۲۵۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۱۶۔دسمبر ۱۹۱۰،ص ۷۷

۲۶۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۱۷۔مارچ ۱۹۱۱،ص ۷۲

۲۷۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۱۳۔ستمبر ۱۹۱۱،ص ۱۶۷

۲۸۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۱۳۔ستمبر۱۹۱۱،ص ۱۶۸

۲۹۔ مباحث ،کونسل آف لیفٹیننٹ گورنر پنجاب،۱۳۔مارچ۱۹۱۶،ص۳۲

۳۰۔ مباحث،پنجاب لیجسلیٹو کونسل ،۲۳ فروری ۱۹۲۱ء ،ص ۸۔۹

۳۱۔ مباحث،پنجاب لیجسلیٹو کونسل ،۱۵ مارچ ۱۹۲۱ء ،ص۳۹۲

۳۲۔ مباحث،پنجاب لیجسلیٹو کونسل ،۲۶ اکتوبر۱۹۲۳ء ،ص ۳۹۷

۳۳۔ مباحث ،پنجاب، لیجسلیٹو اسمبلی ،۲۸ جون ۱۹۳۸ء ،ص ۳۸۱

۳۴۔ مباحث، پنجاب، لیجسلیٹو اسمبلی ،۲۸ جون ۱۹۳۸ء ،ص ۳۸۱۔۳۸۴

۳۵۔ مباحث،مغربی پنجاب، لیجسلیٹو اسمبلی ،۱۹ جنوری ۱۹۴۸ء ،ص۳۲۳۔۳۲۶

۳۶۔ مباحث، پنجاب، لیجسلیٹو اسمبلی ، ۸مئی ۱۹۵۲ء ،ص ۳۳۸۔ ۳۴۶

۳۷۔ مباحث،مغربی پاکستان، لیجسلیٹو اسمبلی ،۸ مارچ ۱۹۵۷ء ،ص ۱۱۷۶

۳۸۔ فائل ایجنڈا ۱۹۶۳ء

۳۹۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ۲۱ مارچ ۱۹۶۳ء ،ص ۱۲۵۶

۴۰۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ، ۲۷ فروری ،۱۹۶۴ء ،ص ۹۶

۴۱۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ، ۲۷ فروری ۱۹۶۴ء ،ص ۹۶

۴۲۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ،۲۷ فروری ۱۹۶۴ء ،ص ۱۰۶، چین کے وزیراعظم جناب چواین لائی نے مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۶۴ء کو مغربی پاکستان اسمبلی کے اجلاس سے خطاب کیا۔

۴۳۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ، ۱۸ مارچ ۱۹۶۴ء ،ص ۹۹

۴۴۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ، ۱۸ مارچ ۱۹۶۴ء ،ص ۱۰۰

۴۵۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان، ۲۰ مارچ ۱۹۶۴ء ،ص ۴۸۔۴۷

۴۶۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ، ۶ اپریل ۱۹۶۴ء ،س ۶۵

۴۷۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ، یکم جولائی ۱۹۶۴ء ،ص ۸۰

۴۸۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ، یکم جولائی ۱۹۶۴ء ،ص ۸۵

۴۹۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ، یکم جولائی ۱۹۶۵ء ،ص ۱۵۸۵

۵۰۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ، ۵ دسمبر ۱۹۶۶ء ،ص ۲۵۰۶۔۲۵۰۵

۵۱۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ، ۵ جون ۱۹۶۷ء ،ص ۳۳۵۸۔۳۳۰۰

۵۲۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ،۲ جولائی ۱۹۶۸ء،ص ۱۱۴۷۵

۵۳۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ، ۱۶ جولائی ۱۹۶۹ء،ص ۲۳۵۳

۵۴۔ مباحث،صوبائی اسمبلی مغربی پاکستان ، ۱۶ جنوری ۱۹۶۹ء،ص ۲۳۵۸

۵۵۔ مباحث،صوبائی اسمبلی پنجاب ، ۷ جولائی ۱۹۷۲ء،ص ۱۲۲۲

۵۶۔ فائل ایجنڈا ،۱۹۷۲ء

۵۷۔ مباحث،صوبائی اسمبلی پنجاب ، ۲۵ جنوری ۱۹۷۳ء،ص ۸۳۳

۵۸۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، پاکستان میں اردو کا مسئلہ، خیابان ادب لاہور: ۱۹۷۶ء،ص ۶۶

۵۹۔ مباحث،صوبائی اسمبلی پنجاب ، ۱۱ جون ۱۹۹۱ء،ص ۶۹۱

۶۰۔ مباحث،صوبائی اسمبلی پنجاب، ۱۸ جون ۱۹۹۱ء،ص ۱۲۲۹

۶۱۔ مباحث،صوبائی اسمبلی پنجاب ،۲۴ ستمبر ۱۹۹۱ء،ص ۱۵۵

۶۲۔ فائل ایجنڈا ،۱۹۹۳ء

۶۳۔ فائل ایجنڈا ، ۱۹۹۷ء

ڈاکٹر محمد اشرف کمال
صدر شعبہ اردو: گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج بھکر

اردو شاعرات ۱۸۵۷ء سے پہلے
ایک نسوانی تاریخ

Since old times women are writing poems. The primitive signs of poetry can be found in early Deccan poetry. Wherein a large number of poets and poetesses were living together. The first poetess who compiled her poetry was Mah Laqa Chanda Bai (1181H-1240H) she belonged to Deccan. Her Poetry book was compiled in 1213H (1798). Her real name was Chanda Bai, title Mah Laqa and her literary name was Chanda. Some Researchers are of the opinion that the first poetess having her poetry book was Lutfunisa Imtiaz, born in 1176H. According to them the poetry book of Lutfunisa was compiled a year before Mah Laqa.

انسان بحیثیت مرد اور عورت سوچنے سمجھنے اور لکھنے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔عورت کمزور وناتواں سہی مگر تخلیقی کرب برداشت کرنے میں مرد سے زیادہ حوصلہ اور ہمت رکھتی ہے۔اور اس حوالے سے وہ کئی مراحل سے گزرتی ہے جس سے مرد نہ گزرتا ہے اور نہ گزر سکتا ہے۔شعروادب چونکہ انسانی جذبات واحساسات اور تخلیقی تجربوں کے اظہار کا نام ہے تو اس میں عورت مرد سے کیسے پیچھے یا کم تر ہوسکتی ہے۔محسوسات اور جذبات عورت کے بھی ہیں ۔ وہ بھی خواب دیکھتی ہے، ،خواہشیں رکھتی ہے اور محرومیوں اور ناآسودہ جذبات کا رونا روتی ہے۔اردو شاعری میں بھی دوسری زبانوں کی طرح مرد شعراء کے ساتھ ساتھ خواتین شاعرات کی ایک بڑی تعداد نظر آتی ہے۔مگر بہت سی تہذیبی، معاشرتی،علاقائی رسم ورواج اور مذہبی حد بندیوں کی وجہ سے وہ مردوں کی طرح اپنے شعری جذبات کا کھلم کھلا اور برملا اظہار نہیں کرسکتی۔ ڈاکٹر نجمہ صدیقی لکھتی ہیں:

> ''معلوم تاریخ کے مطابق عورت اور لفظ کا رشتہ تقریباً تین ہزار سال سے قائم ہے۔قدیم مصری تہذیب میں محفوظ شاعری کے نمونوں سے لے کر آج تک عورت نے انفس وآفاق کے درمیان پھیلی ہوئی اس دنیا میں جو سوچا، جو محسوس کیا ہے وہ ہماری ادبی تاریخ کا بہت اہم حصہ ہے۔مظلومی اور محرومی سے شعوروآگہی اور اختیار واعتبار کا یہ سفر اپنے جلو میں جدوجہد کی ایک روشن تاریخ لیے ہوئے ہے۔ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی اہمیت اور اس کے حق کا اعتراف کیا جائے۔''(۱)

عورت اور مرد اس کائنات کا ناگزیر حصہ ہیں۔مختلف اوقات میں دونوں کسی نہ کسی معاملے میں ایک دوسرے پر فوقیت بھی رکھتے ہیں۔آریا آج سے تین ہزار سال قبل جب اس دھرتی پر وارد ہوئے تو ویدوں کے آخری دور تک آتے آتے (جو ۹۰۰ ق۔م

کے لگ بھگ ہے)ان دیوتاؤں اور ارضی دیویوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا تھا ۔واچ ھن دولت اورتقریر کی دیوی تھی اور پرتھوی دھرتی کی دیوی تھی، ارنیانی جنگل کی دیوی تھی۔۔آغاز کار میں آریہ پدری نظام کے زیر اثر زیادہ تر دیوتاؤں ہی کی پرستش کرتے تھے لیکن بعد ازاں دیویاں جو مادری نظام کی علمبردار تھیں ابھر کر سامنے آتی چلی گئیں۔(۲)مختلف ممالک اور علاقوں میں آج بھی دیوتاؤں کے ساتھ ساتھ دیویوں کی پوجا کی جارہی ہے جوعورتوں کی اہمیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔بقول صغرا مہدی:

''شاعری سے خواتین کا رشتہ بہت پرانا ہے۔یونان کی قدیم شاعرہ سیفو کے لیے رگ وید کی کتنی ہی حمدیں عورتوں کی لکھی ہوئی ہیں۔''(۳)

دکن کی سرزمین بہت عرصہ اردو زبان اورشعروادب کی آبیاری میں اہم کردار ادا کرتی رہی ہے۔یہاں اردو کو سرکار اور دربار کی سرپرستی حاصل رہی جسے وہ دکنی کے نام سے موسوم کرتے تھے۔یہاں شاعروں کی ایک بڑی تعداد موجود تھی اور شاعرات کی بھی۔ ڈاکٹر شبیہہ الحسن لکھتے ہیں:

''اردو شاعری کے ابتدائی نقوش دکن میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔اس عہد میں مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی شعروادب سے تمسک رکھتی تھیں۔ان کی شاعری کا معیار یقیناً پست تھا تاہم ان کے اشعار کے عمیق مطالعہ سے ان کے جذبات کی گہرائی اور احساسات کی گیرائی کا اندازہ ضرور لگایا جاسکتا ہے۔''(۴)

دکن ایک ایسا علاقہ ہے جہاں برصغیر میں سب سے پہلے اردو کو سرکار اور دربار کی سرپرستی حاصل رہی۔ڈاکٹر روبینہ ترین اس حوالے سے لکھتی ہیں:

یہ علاقہ ولی جیسا کوئی اور بڑا شاعر تو پیدا نہ کر سکا البتہ اس علاقے کو یہ خصوصیت رہی کہ یہاں خواتین بھی شعروسخن کی دنیا میں اپنی تخلیقات کے ذریعے شامل رہیں اور پھر اردو کی پہلی شاعرہ تو نہیں لیکن پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ماہ لقا چندا بائی (۱۱۸۱ھ تا ۱۲۴۰ھ) کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔''(۵)

مغل حکمرانوں کی زبان فارسی تھی جس کی وجہ سے ہندوستان میں فارسی کا عمل دخل زیادہ ہوا۔مگر جب ان کے رشتے ناتے ہندو مہاراجوں کے ساتھ ہوئے تو ہندی عورتوں کی وجہ سے فارسی اور ہندوستان کی مقامی زبانوں کا اختلاط ہوا۔فارسی بولنے اور لکھنے والوں کی زبان میں ہندی زبانوں کی چاشنی شامل ہوگئی۔نور جہاں زبان فارسی تھی اس کی شاعری کے نمونے اس دور کی یادگار ہیں۔ ''جلوہ خضر'' کی روایت کے مطابق اس نے اردو میں شعر لکھے ہیں:

دیں جگہ زخم جفا کو دل صد چاک میں ہم
دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بتِ بے باک میں ہم
نقشِ پا کی طرح اے راحتِ جانِ عاشق
تیرے قدموں سے جدا ہو کے ملے خاک میں ہم

ان اشعار کی زبان کی وجہ سے میں نہیں سمجھتا کہ یہ نور جہاں کے اشعار ہوں گے ،شاید بعد میں کسی نے ان کے نام کے ساتھ

منسوب کر دیے ہوں۔جلوہ خضر اور گارسیں دتاسی کی روایت کے مطابق عالمگیر کی بیٹی زیب النسا جو کہ دلرس بانو کے بطن سے تھی،دلرس بانو مرزا بدیع الزماں عرف شاہنواز خان کی لڑکی تھی جو شاہانِ ایران کی نسل سے تھا۔ دلرس کا مقبرہ اورنگ آباد میں ہے جسے تاج محل ثانی کہا جاتا ہے۔زیب النسا کے لیے اردو شعر کہنا اس لیے آسان تھا کہ عالمگیر کے عہد میں اردو نسبتاً پختہ ہو چکی تھی۔(۶)

سلاطین بہمنیہ شاہی وعادل شاہی کی طرح سلطنت آصفیہ کے دور نے بھی اردو کی ترقی میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کے عہد میں نہ صرف بڑے بڑے شعرا پیدا ہوئے جنھوں نے نظم ونثر کی کتابیں تصنیف کیں بلکہ دکنی شعرا کے تذکرے لکھنے کی بھی ابتدا ہوئی اور اسی دور میں ہی دکنی شعرا اور ادیب حیدرآباد میں جمع ہوئے۔ یہی وہ دور تھا جب یہاں کی شاعرات کا ذکر تذکروں میں ہونے لگا اگرچہ یہ بہت کم ہوتا لیکن کہیں کہیں شاعرات کے نام آنے لگے۔اردو کی پہلی خاتون شاعرہ اس دور میں ماہ لقا چندا تھی جس کا دیوان ۱۲۱۳ھ بمطابق ۱۷۹۸ء میں مرتب ہوا۔ اس کا اصل نام چندا بائی خطاب مہ لقا اور تخلص چندا تھا۔(۷)اس کے دیوان میں ۱۲۵ غزلیں شامل ہیں۔

چندا کی ولادت ۱۱۸۱ھ کو ہوئی۔اس کے والد کا نام بہادر خاں تھا جو موروثی طور پر بسالت خاں کے خطاب سے سرفراز تھا۔وہ مرزا سلطان نظر کے فرزند تھے۔مرزا سلطان نظر بسالت خاں، صلابت خاں اور معظم خاں کے خطابات سے نوازے گئے۔مرزا سلطان نظر ترکی الاصل تھے ان کے والد مرزا محمد یار شہر بلخ کے نہایت معزز وعالی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔مرزا محمد یار شاہجہان کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔اور منصب داروں کے زمرے میں شامل ہوگئے۔یہاں انھوں نے ہندوستان ہی میں شادی کرلی۔جس کے بطن سے سلطان نظر پیدا ہوئے وہ سن شعور کو پہنچے تو شہزادے محمد اعظم شاہ کے ملازمین میں شامل ہوکر تین ہزاری منصب اور صلابت خاں کے خطاب سے نوازے گئے۔اور دیوان خاص کے داروغہ مقرر ہوئے۔بہادر شاہ اول کے مارے جانے کے بعد ان کے چاروں بیٹے اپنی بادشاہی قائم کرنے کی کوشش میں تھے سلطان نظر نے جہاندار شاہ کا ساتھ دیا ۔ جہاندار شاہ نے فرخ سیر سے شکست کھائی تو سلطان نظر امیر الامراء ذوالفقار خاں کی کوششوں سے اپنے منصب پر ہی بحال رہے۔ امیر الامراء حسین علی خاں صوبہ جات دکن کے انتظامات کے لیے روانہ کیے گئے تو سلطان نظر ان کے ہم رکاب تھے۔۱۱۲۷ھ میں سلطان نظر ایک جنگ میں کام آگئے اور اپنی حویلی میں مدفون ہوئے۔(۸)

چندا کے نانا کا نام خواجہ محمد حسین تھا جو عہد محمد شاہ میں (۱۷۱۹-۴۸ء)میں قصبہ بارہہ سے دہلی آگئے تھے۔خواجہ محمد حسین نے جب اپنی فضول خرچی سے سب کچھ اڑا دیا اور شاہی خزانے سے بھی خرد برد کی تو اپنی بیوی چندا بی بی (ماہ لقا چندا بائی کی نانی) اور پانچ اولادوں کو چھوڑ کر روپوش ہوگیا۔ان کا گھرانہ مختلف برے حالات سے گزرتا ہوا آخر کار اورنگ آباد چلا گیا وہاں ان کی بڑی بیٹی میدا بائی عرف راج کنور بائی کی شادی بہادر خاں سے ہوگئی۔بہادر خاں پہلے سے شادی شدہ تھے۔جب ان کے ہاں ۲۰ ذی قعد ۱۱۸۱ھ کو میدا بی بی المعروف راج کنور بائی کے بطن سے ایک ماہ پیکر حور منظر لڑکی پیدا ہوئی تو ان کی عمر ۵۵ سال سے زائد تھی۔اس لڑکی کا نام چندا بی بی رکھا گیا۔(۹)

نصیرالدین ہاشمی نے پہلی صاحب دیوان شاعرہ لطف النسا امتیاز کو قرار دیا ہے ان کے مطابق لطف النسا کا دیوان مہ لقا کے دیوان سے ایک سال پہلے مرتب ہوا تھا۔مگر وہ اس کا کوئی واضح ثبوت فراہم نہ کر سکے۔(۱۰)ان کا دیوان ۱۲۱۲ھ میں چندا کے دیوان سے ایک سال قبل مرتب ہوا۔(۱۱)

درج ذیل اشعار لطف النساء امتیاز کے ہیں (پیدائش ۱۷۶۱ء) جس کا دیوان چندا سے ایک برس پہلے مرتب ہوا تھا:

آب رواں ہو بندہ ہو اور گلعذار ہو
ساقی ہو جام اور بغل میں نگار ہو
شور صحرا میں مرے آنے کی کچھ دھوم سی ہے
عمل قیس کے اٹھ جانے کی کچھ دھوم سی ہے(۱۲)

چندا کا دیوان ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۷۹۸ء مرتب ہوا۔ چندا کے کلام میں سوائے غزل کے کوئی صنف شاعری نہیں ہے۔ اس کی ہر غزل ۵ اشعار پر مشتمل ہے جو روایت کی پابندی میں بھی ہے۔ لیکن غالباً اس کی پختگی سے حسنِ عقیدت کا اظہار بھی ہے ۔ جملہ ۱۲۵ غزلوں میں سے سات چھوڑ کر باقی ۱۱۸ غزل کے مقطعوں میں مدح حضرت علی موجود ہے۔(۱۳)

چندا نے اپنے دیوان کا آغاز حمد اور نعت سے کیا۔ حمد یہ شعر ملاحظہ ہو:

کہاں طاقت ہے راہِ حمد میں جو ہو زباں گویا
کہ یاں جز عجز وخاموشی نہیں ہے یک جہاں گویا

(دیوان مہ لقا بائی چندا،ص۹۳)

دوسرا شعر نعت کا ہے:

نہ ہو نعتِ محمد میں کسی سے محفل آرائی
بچا رکھ ہرزہ گوئی سے زباں کو شمع ساں گویا

(دیوان مہ لقا بائی چندا،ص۹۳)

چندا کے دو شعر ملاحظہ کیجئے:

چندا کو دیکھنے کی جو خواہش کرے کوئی
رکھتا ہو وصف اپنے میں وہ عزو جاہ کا

(دیوان مہ لقا بائی چندا،ص۹۵)

ہر روز جو یوں ہی ستم ایجاد کرو گے
دل عاشقوں کے سینکڑوں برباد کرو گے

(دیوان مہ لقا بائی چندا،ص۱۴۶)

شاہ عالم ثانی کا زمانہ میر سودا انشا، مصحفی ،جرأت اور رنگین کا ہے۔ اس زمانے میں دہلی اور لکھنؤ شعروادب کے مراکز تھے۔ ماحول کے اثرات کی وجہ سے خواتین بھی شعروسخن سے دلچسپی رکھتی تھیں۔

بہادر شاہ ظفر کے دور میں بہت سی شاعرات صاحب دیوان ہوئیں افسوس کہ اکثر دیوان غدر میں تلف ہوگئے۔اس عہد میں خواتین کے تذکرے بھی لکھے گئے جن میں خدیجۃ النسا، افکار خواتین اور سراپائے سخن قابل ذکر ہیں۔(۱۴)

بہت سی مغل شہزادیاں شاعری کرتی تھیں لیکن سماجی حدودوقیود کی وجہ سے ان شاعرات کا نام سامنے نہ آسکا۔نہ ان کی شاعری کو اہمیت دی گئی نہ ان کی شاعری محفوظ کی گئی۔

ہندوستان میں دہلی کے بعد لکھنو شعروادب کا دوسرا بڑا مرکز تھا جہاں اردو شعروادب نے شاہی سرپرستی میں پرورش اور نشوونما پائی۔ یہاں شعروادب کو تہذیب وثقافت کا آئینہ دار سمجھا جاتا تھا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے واجد علی شاہ اختر کو لکھنؤ سے معزول کر کے کلکتہ بھیج دیا۔ وہاں مٹیا برج میں نظر بندی کے دوران لکھنؤ کے بیشتر شعرا اور شاعرات بھی کلکتہ آگئے اور وہاں لکھنو کی طرح محفلیں سجنے لگیں۔ڈاکٹر الف انصاری لکھتے ہیں:

''اُن دنوں مٹیا برج میں بادشاہ کے دربار میں ممتاز اور باکمال ادبا وشعرا اور شاعرات اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھیں ۔اس دور میں بادشاہ نے دربار کے بیشتر شعرا شاعرات کو خطابات سے نوازا تھا ان میں سات عظیم شعراء درخشاں، بہار،اشک،عیش ،ہنر، برق اور صولت کو بادشاہ سبعہ سیارہ کے نام سے یاد کرتے تھے شاعرات میں عالم آرا بیگم عالم، حیدری بیگم قمر، عزت محل عشرت، بیگم رشک محل،سلطنت جہاں بیگم،محبوب ،نواب صدر محل صدر، نواب بیگم حجاب اور بیگم حضرت محل سب کی سب واجد علی شاہ اختر کی بیگمات تھیں ۔تاریخ شاہد ہے کہ بیشتر مغل بادشاہ شاعر تھے اور ان کی بیگمات اور شہزادیوں نے بھی شاعری کی ہے۔''(۱۵)

عالم آرا بیگم عالم کی شادی واجد علی شاہ سے ہوئی ایک دیوان بیاض عشق ایک مثنوی'' مثنوی عالم''لکھیں شاعرہ کے ساتھ ساتھ موسیقار بھی تھیں۔آخری وقت تک مٹیا برج کلکتہ میں رہیں۔عبدالغفور نساخ نے بھی ان کے اشعار اپنی تصنیف میں درج کیے ہیں۔

بے قراری کیا بیاں ہو اس دل بے تاب کی
شور نالہ سے ہمارے عرش تھرانے لگا

حیدری بیگم قمر اردو فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتی تھی۔عرفیت ماہِ طلعت تھی۔مرزا ہمایوں بخت کی صاحبزادی تھیں۔نواب کے ساتھ کلکتہ آئیں اور ۱۸۶۵ء میں انتقال ہوا۔

نہ پوچھ اے ہم نشیں ہم سے شبِ فرقت کی بیتابی
الم ہے دردو حسرت ہے فغاں ہے آہ وزاری ہے

عشرت محل عشرت بادشاہ کے ساتھ کلکتہ آئی تھیں اور واجد علی شاہ کے حرم میں تھیں۔

گرمیء عشق نہ مانع نشوونما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

بیگم رشک محل پنجابی خاتون تھیں اور رقاصہ تھیں ،بادشاہ کی شریک حیات روایتی شاعرہ تھیں، ان کا تخلص بیگم تھا۔

نہ بھیجوں گی سسرال میں تم کو خانم
نہیں مجھ کو دوبھر ہے کھانا تمھارا

سلطنت جہاں بیگم محبوب کا تخلص محبوب تھا واجد علی شاہ کی بیگمات میں سے ایک تھیں۔محبوب محل کا خطاب ملا۔غزل کی شاعرہ تھیں اور عمدہ ادب کا ذوق رکھتی تھیں ۔

نہ نکلی حسرتِ دل ایک بھی کہ موت آئی
ہمیشہ تڑپے گی تیرے لیے مزار میں روح

نواب صدر محل صدر بھی واجد علی شاہ کی بیگمات میں سے تھیں صاحب دیوان شاعرہ تھیں ان کا رنگِ تغزل عشقیہ ہے۔بادشاہ نامہ ان کی تصنیف ہے۔

حسرت و آرزوئے وصل درد و مصیبت فراق
سب کا ہے لطف الگ الگ سب کا مزا الگ الگ

نواب بیگم حجاب :کا تخلص حجاب اور چھوٹی بیگم عرفیت تھی۔غازی الدین حیدر بادشاہ کی بھتیجی تھیں اور واجد علی شاہ سے نکاح ہوا۔۔زندگی کے آخری ایام تک کلکتہ واجد علی شاہ کے ساتھ رہیں۔صاحب دیوان اومنفرد لہجے کی شاعرہ تھیں۔

بن کے تصویر حجاب اس کو سراپا دیکھو
مونہہ سے بولو نہ کچھ آنکھوں سے تماشہ دیکھو

بیگم حضرت محل واجد علی شاہ کی شریک حیات تھیں ان کا نام افتخارالنساء بیگم اور حضرت محل تخلص تھا۔وہ شاعرہ کے ساتھ ساتھ مجاہدہ بھی تھیں جنھوں نے جنگ آزادی میں بھرپور حصہ لیا اور فوج کی قیادت بھی کی۔

نہ تخت اور تختہ اسیری نہ شاہی
مقدر ہوئی ہے جہاں کی گدائی(۱۶)

دہلی کو علم وادب کے حوالے سے مرکزیت حاصل رہی۔صغرا مہدی دہلی کی درج ذیل خواتین شاعرات کا ذکر کرتی ہیں:

بسم اللہ بیگم دہلوی:منشی انعام اللہ خاں یقیں کی شاگرد تھیں اور جانِ جاناں مظہر(۱۶۹۹ء۔۱۷۸۱)سے اصلاح لیا کرتی تھیں۔

تری الفت میں یہ حاصل ہوا ہے
گہے مضطر ہے دل گاہے تپاں ہے
نہ کیجئے ناز حسنِ عارضی پر
نہ سمجھو یہ بہارِ بے خزاں ہے

جینا بیگم: بنت مرزا جہاندار شاہ بہادر ولی عہد احمد شاہ دہلی (۱۷۴۷ء۔۱۸۵۴ء) کی خاص محل اور مرزا رفیع سودا کی شاگرد تھی۔ان کا یہ شعر ملاحظہ کیجئے:

ڈبڈبائی آنکھ آنسو تھم رہے
کاسۂ نرگس میں شبنم رہے

یاد: یادتخلص کرتی تھیں۔ نام کا پتہ نہیں چل سکا۔ خاندان تیموریہ کی شہزادی تھیں۔مصنف نے ''شاعراتِ اُردو''، ''افکارِ خواتین'' کے حوالے سے لکھا ہے۔ یہ مندرجہ ذیل شعر حالتِ نزع میں کہا ہے:

سرانجام غسل و کفن کر رکھو
تنِ زار سے جاں نکلنے کو ہے
(ص۳۲، دہلی کی خواتین)

اختر: نواب اخترمحل نام اور اخترتخلص تھا۔ تیموری شہزادی تھیں۔ ۱۸۷۶ء تک زندہ رہیں ۔نہایت ذہین اور نیک مزاج تھیں۔'' تذکرۃ الخواتین'' اور ''شاعرات اردو''میں اُن کا مندرجہ ذیل کلام درج ہے،قدسی کی غل کی تضمین دیکھئے:

لکھ کر ہمارا نام زمیں پر مٹا دیا
لو آج ہم نے اُس کا بھی جھگڑا مٹا دیا

خفی: رام بابو سکسینہ اپنی کتاب "History of Urdu Literatute"میں لکھتے ہیں۔مسٹر بابو کی صاحبزادی تھیں۔ ہندوستانی نام بادشاہ بیگم تھا۔ یوسف والی کے لقب سے مشہور تھیں۔ مصنف ''شاعراتِ اردو'' اور مصنف ''تذکرۃ الخواتین'' نے بھی ایسے ہی لکھا ہے۔ ۱۸۷۷ء تک یعنی جب ''تذکرۂ اندازِ چمن'' لکھا گیا، زندہ تھیں۔نمونہ کلام:

خود شوق اسیری سے پھنسے دام میں صیاد
شرمندہ ترے ایک بھی دانے کے نہیں ہم
جن سے ہم آشنائی کرتے ہیں
ہم سے وہ بے وفائی کرتے ہیں

خاکساری: دہلی کی ایک پردہ نشین خاتون تھیں۔ ۱۸۷۷ء تک زندہ رہی۔نمونہ کلام:

مجھ کو کدورتوں سے ملاتے ہو خاک تک
کہہ دیجیے جو آپ کے دل میں غبار ہو

اشک: پورا نام معلوم نہیں۔ اشکؔ تخلص تھا۔ دہلی کے شاہی خاندان سے تعلق تھا۔صرف دو شعر ان کی یادگار ہیں:

نہ بوسہ دینا آتا ہے ، نہ دل بہلانا آتا ہے
تجھے تو او بُتِ کافر فقط ترسانا آتا ہے
کسی عاشق کا بے شک استخواں ہے میں نہ مانوں گا
کہ شانہ ترے رُخ تک اتنا بے باکانہ آتا ہے

امراؤ: پورا نام حسینی بیگم تھا اور امراؤؔ تخلص کرتی تھیں۔ دہلی میں قیام تھا۔ بہادر شاہ ظفرؔ کی ایک غزل پر غزل کہی ۔جس کے دو شعر ملتے ہیں:

باغ عالم میں چھڑانا تھا اگر اپنوں سے
پہلے ہی سبزۂ بیگانہ بنایا ہوتا
گر یہ منظور نہ تھی خانہ نشینی میری
تو مجھے ساکنِ ویرانہ بنایا ہوتا

(ص ۳۴ ، دہلی کی خواتین)

سومی: ان کا تعلق خاندانِ تیموریہ سے تھا۔ غدر سے پندرہ ، بیس سال پہلے پیدا ہوئیں اور صاحبِ تذکرہ جمیل کے بیان کے مطابق بہت دنوں تک زندہ رہیں۔مندرجہ ذیل اشعار ان کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں:

شور ہے اس کی بے وفائی کا
بس نہیں چلتا کچھ رسائی کا
دام زلفِ سیہ ارے توبہ
نہ بنا ڈھب کوئی رسائی کا

ناز: نام عالم آرا اور نازؔ تخلص تھا۔ خاندان تیموریہ کی شہزادی تھیں۔ غدر کے بعد بھی چند سال زندہ رہیں۔ عالمِ شباب میں شعر وشاعری کا شوق تھا۔نمونہ کلام:

مجھ سے روٹھا وہ یار جانی ہے
جان جانے کی یہ نشانی ہے
کر غلامی علی کی تو اے نازؔ
ہے اگر شوق بادشاہی کا

ثریا: نام بڑی بیگم اور ثریّاؔ تخلص تھا۔ مرزا علی خان کی اہلیہ تھیں جو شاہِ دہلی کے وظیفہ خوار تھے۔ ۱۸۵۷ء میں مرزا علی خان نے رحلت فرمائی ۔ثریّا بیوہ ہو کر آگرہ چلی گئیں اور زندگی کے آخر تک وہیں قیام کیا:

بتا دیں ہم تمہارے کاکل شب گوں کو کیا سمجھے
سیہ بختی ہم اپنی یا اسے کالی بلا سمجھے
جسے دیکھا اُٹھا کر نیم بسمل کر دیا اس کو
تری مژگاں کو ہم سو خار مژگانِ فضا سمجھے

مبارک: نام مبارک النساء، تخلص مبارک تھا۔ شاہ نجم الدین صغیر خلف شاہ نصیر کی بی بی تھیں، دہلی وطن تھا۔ ۱۸۸۰ء میں مکہ معظّمہ چلی گئیں اور وہیں مستقل اقامت اختیار کر لی۔

مجھے کیا خوف محشر ہو مبارک دن قیامت کا
پکڑ لوں گی میں گوشۂ دامنِ خاتونِ جنت کا

ماہ: یہ دہلی کی رہنے والی تھیں۔ جناب آسی صاحب مصنف ''تذکرۃ الخواتین'' نے اُنہیں ''صاحبِ دیوان'' لکھا ہے۔ دیوان ناپید ہے۔ کالے میاں نامی ایک بزرگ کی مرید تھیں۔ نمونۂ کلام:

ماہ کے دل میں ترا نقش محبت جو ہے اے یار، مٹے گا نہ کبھی
باغِ جنت بھی کوئی دیوے تو درکار نہیں، تیرے کوچے کے سِوا

صاحب: اُمۃ الفاطمہ نام اور صاحب تخلص تھا۔ عبدالباری کے بقول وہ لکھنؤ کی ایک مشہور شاہد بازاری پردہ نشین تھیں۔ بیمار ہو کر دہلی گئیں اور حکیم مومن خان مومن کی طرف رجوع کر کے علاج معالجہ شروع کیا۔ مومن خود حسن پرست تھے بجائے مسیحائی کے الٹا مریض ہو گئے۔ ان کے اشعار میں مومن کا رنگ جھلکتا ہے۔ وہی شوخی، وہی سوز و ساز، وہی رنگ اور بات میں بات نکالنے کا وہی ڈھنگ:

جو خط جبیں کا مرے کاتب ہے اسی کو
دکھلانا مرا نامۂ اعمالِ الٰہی
صاحب جو بتایا ہے وہ مانند زلیخا
یوسف سا غلام اِک مجھے دے ڈال الٰہی

حاتم: یہ ایک پردہ نشین خاتون تھیں۔ دہلوی تخلّص تھا۔ ۱۲۹۳ہجری تک زندہ تھیں۔ زیادہ حالات معلوم نہیں۔ نمونۂ کلام:

مجھ کو کدورتوں سے جلاتے ہو خاک میں
کہہ دیجیے جو آپ کے دل میں غبار ہے
دشمن کا شکوہ تم نہیں سنتے نہیں سہی
میرا ہی غم سنو نہ اگر ناگوار ہو

حیا: نام حیات النسا ،عرف بھورا بیگم۔ شاہ عالم دہلی کی صاحبزادی تھیں اور شاہ نصیر کی شاگردہ تھیں۔ابتدائے عمر سے شاعری سے شغف تھا، اسی شوق کے باعث عمر بھر ناکتخدا رہیں۔ غدر سے پہلے عہدِ بہادر شاہ ظفرؔ میں انتقال ہو گیا۔نمونۂ کلام:

نہ کیوں حیرت ہو یارب وہ زمانہ آ گیا ناقص
حیاؔ ڈھونڈے ، نہیں ملتی برائے نام سو سو کوس

حیدری:تخلص حیدریؔ ،خانم نام تھا۔ بشارت اللہ خاں دہلوی مصاحبِ خاص بادشاہ دہلی کی اہلیہ تھیں۔شعروسخن کا ذوق رکھتی تھیں۔ستّر برس کی عمر پائی۔غدر ۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے راہیٔ عالم بقا ہوئیں۔نمونۂ کلام نہیں مل سکا۔ایک شعر ملتا ہے

حیدری نام ہے تیرا کیا خوب
جو کہ تجھ سے پھرا وہ حیدر ہے

خورشید:تخلص خورشید اور غالباً نام بھی یہی تھا۔ دہلی کی ایک عصمت مآب سیّد زادی تھیں۔وہ ناکتخدا تھیں۔ ان کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے ۔مرثیہ وغیرہ خوب کہتی تھیں۔نمونۂ کلام نہیں مل سکا۔

رعنائی:قدسیہ بیگم دہلی کی رہنے والی تھیں۔ایک شعر ریختی کے انداز میں ملا جو درجہ ذیل ہے:

میں جانتی تھی آنکھ لگی دل کو سُکھ ہُوا
کم بخت کیسی آنکھ لگی اور دُکھ ہوا

راویہ:دِلی سیتارام بازار میں رہتی تھی۔ ۔نہایت عمدہ شعر کہتی تھیں۔

ہوتی نہ محبت تو یہ آزار نہ ہوتا
دل عشق کے صدموں سے خبردار نہ ہوتا
دے اپنی محبت مجھے اے یار خدایا
کر دور دلِ زار کا آزار خدایا

ضرورت: شرف النسا نام ،ضرورتؔ تخلص تھا۔ اہلیہ مرزا کوچک جو دہلی کے ایک بزرگ نسل تیموریہ سے تھے ۔نعتیہ شعر کہتی تھیں:

سرسبز رہے باغ سدا دین نبیؐ کا
مکی مدنی ہاشمی و مطّلبی کا

طاہرہ:تذکرۂ خواتین میں لکھا ہے کہ یہ دہلی کی پردہ نشین خاتون تھیں۔اپنے کلام کو شائع کرانا پسند نہیں کرتی تھیں۔

ظلم صیاد کا گلشن سے عیاں ہوتا ہے پتے
پتے کی زباں سے وہ بیاں ہوتا ہے

زینت جان دہلوی: نازک تخلّص کرتی تھیں۔ زمانہ اٹھارویں صدی ہے۔

موجود ہے ہر آن جو نزدیک ہمارے
وہ وہم و گماں سے بھی حقیقت میں پرے ہے

بنّو: دلی کی ایک پردہ نشین طوائف تھیں۔شاہ عالم ثانی کے عہد میں گلاب سنگھ آشفتہ اس پر فدا تھا۔بنو بھی اس پہ فریفتہ تھیں۔یہ وہ شعر ہیں جو آشفتہ کے مرثیہ بطریقِ نوحہ خوانی بنّو نے کہے تھے:

چھوڑ کر مجھ کو کہاں او بُت گمراہ چلا
تو چلا کیا کہ یہ دل بھی تیرے ہمراہ چلا
چھٹ گیا غم سے مرا کشتۂ ابرو مر کر
اِک چھری میرے گلے پر بھی مری آہ چلا

آرائش: دہلی کی ایک طوائف تھیں مگر پردہ نشینوں کو بھی مات کر دیا کہ مصنف'' تذکرۂ چمن انداز'' کو اس کا حال، اُس کا نام، اُس کے زمانے کے بارے میں میں بھی نہیں معلوم ہو سکا۔صرف ایک شعر مل سکا:

جوانی میں بھلی معلوم ہوتی تھی یہ آرائش
بڑھاپے میں تو مہندی مَسّی کی ہے خاک زیبائش

مُغلّ: بیبا جان مُغل بنت امیر بیگم دہلی کی تھیں اور اِملی والی پہاڑی کے محلے میں رہتی تھیں۔موسیقی میں مہارت کے ساتھ شعر بھی کہتی تھیں۔نمونۂ کلام:

جب کہ اُس قاتل نے قتل عام پر باندھی کمر
وائے ناکامی کہ واں خلق خدا تھی میں نہ تھا
زلف کے بوسہ پہ ناحق ہم سے برہم ہو گئے
یہ دلِ سودائی کی پیارے خطا تھی میں نہ تھا (۱۷)

درج بالا اردو شاعرات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اردو شاعری نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں میں بھی مقبول تھی اور امراء وزراء کے ساتھ ساتھ شہزادیاں بھی شاعری کرنے کو اچھا سمجھتی تھیں۔

بہارستان ناز کے نام سے حکیم فصیح الدین رنج(وفات ۱۸۳۵ء) کا دلچسپ تذکرہ(مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی)شاعرات کا تذکرہ ہے۔جو۱۸۶۴ء میں میرٹھ سے پہلی مرتبہ چھپا۔اس کے بعد ۱۸۶۹ء،اور پھر ۱۸۸۲ء میں طبع ہوا۔مجلس ترقی اردو نے اسے ۱۹۶۵ء میں شائع کیا۔اس میں ۱۷۴ شاعرات کا ذکر ہے،اس میں گنتی کی چند شاعرات کے علاوہ بقیہ سبھی شاعرات طوائفیں ہیں۔(۱۸)چند شاعرات کے اشعار ملاحظہ کیجئے:

گر مجھ کو سرِ کاکلِ خمدار نہ ہوتا
تو یوں میں بلاؤں میں گرفتار نہ ہوتا

(امراؤ)

شب بزم ملاقات میں ہر چند یہ چاہا
آنکھیں میں لڑاؤں کہیں اس رشکِ قمر سے
پر خوف مرے دل میں یہی آیا کہ ہے ہے
نازک ہے نہ دب جائے کہیں بارِ نظر سے

(بہو بیگم)

مٹاؤ نہ ہم کو بتو یوں خدارا
یہ سمجھو تو کس کے بنائے ہوئے ہیں

(پری)

نہ گھر کا ہوں نہ در کا ہوں نہ ہوں کوہ وبیاباں کا
جنوں کا زور ہے سودائی ہوں زلفِ پریشاں کا

(جہان)

محبت کے عمل میں عاشقِ جاں باز رہتا ہے
نہیں خالہ کا گھر اس میں جو آئے جس کا جی چاہے

(جعفری)

جان و دل بیچتے ہیں ہم اپنا
ایک بوسے پہ لے لؤستا ہے

(جان)

حضرت ناصح نہ بک بک کر پھرائیں سر مرا
قبلۂ من! چپ بھی رہئے بس نصیحت ہو چکی

(حجاب)

بوسہ دیں گے نہ وہ تجھے زہرہ
منہ لگاتا ہے کون سائل کو

(زہرہ)

تھی وہ نگاہ یا کوئی ناوک کا تیر تھا!
ملتے ہی آنکھ رہ گیا میں کہہ کے ہائے دل

(سلطان)

بے جرم مجھ کو یار نے مارا ہے دوستو
اب دل ہی دل میں کہتا ہوں فریاد ہائے دل

(سردار)

یا تو گھر اس کے میں جاؤں گا یا آئے گا یار
وصل کے خواب کی بس ہیں یہی تعبیریں دو

(شرم)

پری زادوں میں تم مشہور ،میں مشہور دیوانہ
اگر تم شمع محفل ہوتو یہ بندہ ہے پروانہ

(شیریں)

گرمیٔ سوز جگر سے ہوگیا یوں جل کے خاک
یہ شرارت آتشِ رخسار سے قاتل نے کی

(شرارت)

رقیبوں کا جلنا کہاں دیکھتا تو
سماں یہ مرے گھر میں آیا تو دیکھا

(صاحب)(۱۹)

ماضی میں طوائفوں کے ہاں تعلیم ،رقص اور شعروشاعری کا زیادہ رجحان نظر آتا ہے۔ خاص کر ۱۸۵۷ء سے پہلے لکھنؤ کا معاشرہ اس کا ایک معتبر حوالہ ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

''ماضی میں صرف طوائف ہی اتنی تعلیم یافتہ اور شعرفہم تھی کہ تخلیقی اظہار کے لیے شاعری کرسکتی تھی،گنتی کی صرف چند شہزادیاں یا اعلیٰ خاندانوں کی بیگمات یا بیٹیاں ملتی ہیں جیسے نواب اختر محل بیگم، نواب یوسف علی والیٔ رام پور کے اہل خانہ میں سے بہو بیگم ،نواب آصف الدولہ کی بیگم جان جانی، شاہ جہاں کی بیٹی ضہاں آرا، اورنگ زیب کی بیٹی زیب النساء مخفی اور شاہ عالم ثانی کی بیٹی حیات النساء حیات وغیرہ۔''(۲۰)

جنوبی اور شمالی ہند میں اردو شاعری میں عورت مردوں سے پیچھے نہیں تھیں مگر بات حجاب کی تھی جس کی وجہ سے معاشرتی حدود وقیود نے اردو شاعری میں عورتوں کے ناموں کو سامنے نہ آنے دیا۔شمالی ہند میں اردو شاعرات کے حوالے سے ڈاکٹر شبیہہ الحسن لکھتے ہیں:

''شمالی ہند میں بھی شاعرات کی کثیر تعداد موجود تھی جو حجابی دائروں میں رہتے ہوئے بھی شعروادب کی آبیاری میں

مصروف تھیں۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ بعض مستورات غالب سے اپنے کلام پر اصلاح لیتی تھیں۔تاہم ایک سوال ہنوز حل طلب ہے کہ تمام تر صلاحیتوں کے باوجود آج تک میر و غالب کے معیار کی کوئی شاعرہ کیوں پیدا نہ ہوسکی؟''(۲۱)

مختلف تذکروں سے اگر حقائق کو سامنے لایا جائے تو اردو شاعرات کی ایک بڑی تعداد بنتی ہے۔مگر مرد شعراء کے مقابلے میں یہ پھر بھی بہت کم تعداد ہے۔اس کی بنیادی وجہ معاشرتی جبر اور گھریلو دباؤ اور ہماری اقدار ہیں جن کی وجہ سے بہت سی خواتین میں شعری اور تخلیقی وادبی صلاحیت ہونے کے باوجود مواقع میسر نہیں آتے کہ وہ اپنے تخلیقی جوہر کو سامنے لاسکیں۔بعض ایسی خواتین بھی ہیں جو شاعری کرتی ہیں مگر وہ کسی کو دکھانے یا شائع کرانے سے شرماتی ہیں یا اپنے معاشرتی خوف کی وجہ سے اسے ظاہر نہیں کرتیں۔یہ معاشرہ مردوں کا معاشرہ تصور کیا جاتا ہے جس میں عورت اس طرح آزاد نہیں ہے جیسے مرد۔

حوالہ جات

۱۔ نجمہ صدیق، ڈاکٹر، پیش لفظ مشمولہ، پاکستانی خواتین کے رجحان ساز ناول، اظہار سنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۱۱

۲۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۶۷

۳۔ صغرا مہدی، پروفیسر، اردو ادب میں دہلی کی خواتین کا حصہ، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص۳۰

۴۔ شہیہہ الحسن سید، ڈاکٹر، اردو شعروادب کی معمار خواتین، اظہار سنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۱۲

۵۔ روبینہ ترین، ڈاکٹر، ملتان میں لسانی تشکیلات کا عمل اور دوسرے مضامین، مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد، ۲۰۰۴ء، ص ۵۷

۶۔ وحیدہ نسیم، عورت اور اردو زبان، غضنفر اکیڈمی پاکستان، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص۴۱

۷۔ روبینہ ترین، ڈاکٹر، ملتان میں لسانی تشکیلات کا عمل اور دوسرے مضامین، ص۵۷، ۵۸

۸۔ پیش لفظ از شفقت رضوی، دیوان ماہ لقا چندا بائی، مرتبہ شفقت رضوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، اپریل ۱۹۹۰ء، ص۵، ۶

۹۔ ایضاً، ص۱۶، ۱۷

۱۰۔ بحوالہ، حواشی، ملتان میں لسانی تشکیلات کا عمل اور دوسرے مضامین، ص۵۸

۱۱۔ نصیرالدین ہاشمی، دکنی کے چند تحقیقی مضامین، ص۱۷۶ بحوالہ، دیوان ماہ لقا بائی چندا، ص۴۴

۱۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستانی شاعرات تخلیقی خدوخال، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۲۰۰۸ء، ص۵۳

۱۳ پیش لفظ از شفقت رضوی، دیوان مہ لقا چندا بائی، مرتبہ شفقت رضوی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۴۶، ۴۷

۱۴۔ صغرا مہدی، پروفیسر، اردو ادب میں دہلی کی خواتین کا حصہ، اردو اکادمی دہلی، ۲۰۰۶ء، ص ۸

۱۵۔ الف انصاری، ڈاکٹر، بیگماتِ واجد علی شاہ اختر کی ادبی خدمات، مشمولہ اسباق سہ ماہی، پونہ، اکتوبر تا دسمبر ۲۰۰۷ء، ص۷۰

۱۶۔ الف انصاری، ڈاکٹر، بیگماتِ واجد علی شاہ اختر کی ادبی خدمات، ص۷۰ تا ۷۴

۱۷۔ صغرا مہدی، پروفیسر، اردو ادب میں دہلی کی خواتین کا حصہ، ص۳۱ تا ۴۲

۱۸۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، پاکستانی شاعرات، تخلیقی خدوخال، ص۵۳

۱۹۔ ایضاً، ص۵۴ تا ۵۵

۲۰۔ ایضاً، ص۶۵

۲۱۔ شہیہہ الحسن، ڈاکٹر، اردو شعروادب کی معمار خواتین، ص۱۲

ڈاکٹر رابعہ سرفراز
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو
جی سی یونیورسٹی فیصل آباد

جمالیات کیا ہے

Aesthetics is a study of beauty and taste.We are trying to understand beauty and its components through this article. Allah Almighty likes beauty and this is reflected in His creations. As in the Holy Quran, in surah Al-Jin, He says that," He has created man in the best of moulds". Beauty is not what we see, it actually lies in the eyes of the beholder.

جمالیات کیا ہے؟

جمالیات حسن اور ذوق کے مطالعہ کا نام ہے۔ یہ حسیاتی ادراک کی ایک صورت اور ایک ایسا نظریہ ہے جسے بہت آسانی کے ساتھ سادہ خیالات میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ جب ہم کسی ایسی چیز کے بارے میں کوئی بات کرتے ہیں جو جمالیاتی تجربے کا باعث ہوتی ہے تو درحقیقت ہم فن کی کسی جہت کے بارے میں بات کرتے ہیں لیکن جب ہم فن کے بارے میں کوئی بات کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ ہم لازماً جمالیات کے بارے میں ہی بات کررہے ہیں۔ یہ دونوں مترادف چیزیں نہیں ہیں۔ تمام فن پارے جمالیاتی حس تخلیق نہیں کرتے مثلاً جب ہم کسی پینٹنگ کو دیکھ کر یہ سوچتے ہیں کہ ہم اس کی کتنی قیمت ادا کرسکتے ہیں؛ جمالیات کی بات ثانوی ہوجاتی ہے۔

قرآن حکیم نے حسن کی تشریح اس پیرائے میں کی ہے:

اَلَّذِی اَحسَنَ کُلَّ شَیٍ خَلَقَه (۱)

وہ (خالقِ مطلق) جس نے جو چیز بھی بنائی حسین ہی بنائی

وَ صَوَّرَ کُم فَاَحسَنَ صُورَکُم (۲)

اور تمھاری صورتیں بنائیں تو نہایت حسین صورتیں بنائیں۔

اَللہ نُورُالسّمٰوٰتِ وَالاَرضِ (۳)

اللہ آسمانوں اور زمین کا نُور ہے۔

اور یہ نور جب کسی تخلیق میں ظاہر ہوتا ہے تو اسے حسین وجمیل بنادیتا ہے۔

لَقَد خَلَقنَاالانِسَانَ فی اَحسَنِ تَقوِیم(۴)

بلاشبہ ہم نے انسان کی فطرت یاباطن کو بہت ہی حسین بنایاہے۔

جمالیاتی مطالعے میں یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ کچھ چیزیں مثبت جبکہ کچھ منفی ردعمل کا موجب کیوں بنتی ہیں۔جمالیاتی تجربات کہاں اور کیسے تخلیق ہوتے ہیں؟ یہ بھی ایک اہم اور دلچسپ سوال ہے ۔جمالیاتی موضوع ذہنی فلسفے سے شروع ہوتاہے کیونکہ یہ ان باتوں کو دیکھتاہے کہ ہمارے ذہن اور شعور کے مختلف گوشے کیوں اور کیسے کام کرتے ہیں؟

جمالیات کے بنیادی سوالات مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں مثلاً

زندگی کیسی ہونی چاہیے؟

حسن کیا ہے؟

ہمیں کچھ چیزیں حسین کیوں نظرآتی ہیں؟

سقراط کے نزدیک محبت اپنی خیر یا بھلائی کو ہمیشہ ہی اپنے اختیار میں رکھناچاہتی ہے یہی وجہ ہے کہ والدین اپنی اولاد کی صورت میں ہمیشہ زندہ رہنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔اسی باعث انسان دائمی شہرت کی تمنا بھی رکھتاہے۔اس خواہش کا یہیں پر خاتمہ نہیں ہوجاتا بلکہ یہ اس سے ارفع صورتوں میں اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے ۔یہ خوبصورت اجسام سے گزر کر حسین روحوں تک پہنچتی ہے اور پھر اُس حسن تک جو معاشرے کے قوانین اور اداروں کی تشکیل میں اہمیت کا حامل ہے ۔حُسن کا ارفع مقام روح کی فطری خواہش کی تشفی کرتاہے۔یہ مطلق اور بے نیاز حسن کسی قسم کی تبدیلی کے بغیر دیگر تمام چیزوں کے بڑھنے اور فنا ہونے والے حُسن میں ظاہر ہوتاہے۔اس کے نزدیک اثر پیداکرنے کی صلاحیت حسن ہے اور اثر نہ پیداکرسکنے کی صلاحیت بدصورتی ہے۔علم تمام چیزوں میں سب سے زیادہ حسین ہے اور جہل بدصورتی ہے۔سقراط کے بقول

''۱۔حسنِ مطلق ہی اصل حقیقت ہے اور جن چیزوں کو ہم خوبصورت کہتے ہیں وہ اسی حقیقت کے مظاہر ہیں۔

۲۔حسنِ مطلق قائم بالذات، ناقابلِ تغیر، حی و قیوم اور بے مثل و عدیل ہے ۔

۳۔حسنِ مطلق ہی تمام محاسن اور بھلائیوں کا سرچشمہ ہے۔

۴۔حسنِ مطلق کے مشاہدہ و ادراک کا نام ہی علم ہے ۔یہ علمی خیر ہے اور یہی حیاتِ انسانی کا مقصودِ حقیقی ہے۔''(۵)

ارسطو حسن پیداکرنے کے لیے قدوقامت اور اعضاوجوارح کے تناسب کوضروری سمجھتاہے۔اس کے نزدیک حسن قدوقامت اور اعضاکے صحیح تناسب میں ہے اور اسی لیے طویل نظم یاڈرامے میں پلاٹ کی ہیئت بھی اہمیت کی حامل ہے۔

''اس کا کہنایہ ہے کہ یہ پلاٹ ایساہوناچاہیے جسے یادرکھاجاسکے اس کے یہ معنی ہیں کہ ہیئت پیچیدہ اورطویل نہ ہو۔''(۶)

جب علم تمام چیزوں میں حسین ترین ٹھہرا تو پھر انسان کا وہی فعل حسین ترین ہوسکتاہے جو عقل کے تابع ہے لیکن افلاطون کے

یہاں عقل چونکہ مادی عقل سے مختلف ہے، محسوسات سے آزاد ہے اس لیے وہ ایک گونہ مادی اشیا کے حسن کو تو تسلیم کرتا ہے جو مفید اور روحانی اعتبار سے راحت بخش ہیں لیکن انھیں حقیقی حسن تک پہنچنے کا ایک زینہ تصور کرتا ہے اور چونکہ انسان اس حقیقی حسن تک مادی عقل کے ذریعے حسیات کے ذریعے نہیں پہنچ سکتا بلکہ وجدان کے ذریعے، اس لیے وہ ادبی تخلیق میں وجدان، سرمستی اور ہوش ربائی یا الہامی کیفیت کا قائل ہے۔

افلاطون کے لیے خیر اور حسن ایک ہی چیز کا نام ہے لیکن ارسطو خیر و حسن کو دو الگ الگ چیزیں بتاتا ہے۔

''خیر اور حسن دو مختلف چیزیں ہیں۔ اول الذکر کا اطلاق ہمارے کردار کے ساتھ ہوتا ہے لیکن آخر الذکر ان چیزوں میں بھی ملتا ہے جو متحرک نہیں ہیں۔ حسن کی بنیادی خصوصیات نظامِ تناسب اور تعین ہے۔''(۷)

ارسطو کا کہنا ہے کہ بدصورت چیزوں کی تصویر کشی بھی حسین چیز ہے۔ عام لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ارسطو نے ہر قسم کی تصویر کشی کی اجازت دی ہے اور حسن کا معیار یہ ہے کہ وہ اصل سے قریب ہو لیکن ارسطو نے شاعری اور حقیقت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے یہ کلیہ برآمد نہیں ہوتا۔ ارسطو شعر و ادب کو تخلیقی شے سمجھتا ہے۔ وہ ادب کو جامد اور ساکن اشیا کی مصوری نہیں بتاتا بلکہ ادب کو ایک حرکی قوت تسلیم کرتا ہے۔

وِرجل Vergil نے اپنے اشعار میں کائنات کے جمال و جلال کے گیت گائے ہیں۔ اس کی جمالیاتی خدمت یہ ہے کہ اس نے لوگوں کی جمالیاتی حس بیدار کرنے کے لیے انھیں حسنِ کائنات سے محبت کی ترغیب دی ہے۔

جمالیاتی حوالے سے پلوٹارک Plutarch کا اجتہاد بھی اہم ہے۔ وہ یہ کہ جو شے حقیقت میں بدصورت ہے کیا وہ فن میں خوبصورت بن سکتی ہے؟ پلوٹارک کے نزدیک بدصورت شے فن میں کبھی خوبصورت نہیں بن سکتی لیکن اگر نقل بمطابق اصل ہو تو قابلِ تعریف ضرور ہوتی ہے۔ اگر بدصورت شے کی تصویر خوبصورت ہوگی تو وہ نہ تو موزوں ہوگی اور نہ ہی اصل کے مطابق۔۔۔ حسین ہونا اور خوبی کے ساتھ نقل کرنا دو بالکل مختلف چیزیں ہیں۔

لون جائینس فن میں جلال کو حسن قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی کا مقصد فطرت کی عظیم الشان اور جلیل تخلیقات کی ستائش اور خود بھی اسی قسم کے فن پاروں کی تخلیق ہے۔ اس نے جمال کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے حسن کی صفت تک نہیں سمجھا جبکہ جلال و جمال دونوں ہی حسن کی صفتیں ہیں اور درحقیقت ''جلال'' بغیر ''جمال'' کے ادھورا ہے۔

فلوطینس کے نزدیک اس شخص کا ذہن بڑا ہی کُند، سست رفتار اور جوش و حرکت کے اثرات سے عاری ہے جو اس حسّیہ دنیا کے خوبصورت مظاہر، تنظیم و تناسب اور ستاروں کی ہیئت سے غیر متاثر رہتا ہے اور انھیں دیکھ کر ان سے زیادہ متحیر کن طاقت کا احترام نہیں کرتا۔

''حسین چیزوں سے محبت' یہ چیز شاعر کو اوپر اُٹھاتی ہے''(۸)

فلوطینس کہتا ہے کہ وہ کون سی چیزیں ہیں جن کی شمولیت سے ایک جسم حسین معلوم ہوتا ہے۔ وہ کہتا ہے اس کا ایک عام جواب تو یہ ہے کہ اعضا یا حصوں کے آپس کے رشتوں اور کُل کے رشتوں میں ایک مخصوص تناسب ہوتا ہے اور اگر اس میں رنگ کا اضافہ

کر دیا جائے تو وہ چیز ہماری نظر کو حسین معلوم ہوگی۔اس نظریہ کی بنیاد پر کوئی بھی چیز اپنی کلی ہیئت ہی میں حسین معلوم ہوسکتی ہے ۔ہر حصہ اپنی جگہ پر الگ الگ طور سے حسین نہیں ہوتا بلکہ اس تناسب کی وجہ سے حسین معلوم ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ کُل کو حسین بناتا ہے لیکن اگر کُل حسین ہے تو اجزا بھی حسین ہیں کیونکہ کُل کا حُسن بدصورت اجزا مرتب نہیں کر سکتے اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ حسن کا تصور تناسب سے ماورا ہے اور متناسب چیزیں اور اسباب کی بنا پر حسین معلوم ہوتی ہیں کیونکہ بہت سی ایسی چیزیں جو تناسب کی وجہ سے نہیں بلکہ رنگ کی وجہ سے حسین معلوم ہوتی ہیں مثلاً سونا یا اندھیری رات میں بجلی کی چمک وغیرہ۔فلوطینس کا کہنا ہے کہ حسن مادے میں عقل کے اظہار کا نام ہے جو ربّانی ہے۔حسن دریافت کرنے کی ایک مخصوص صلاحیت ہوتی ہے جو خالص روحانی ہے:

"After considering other theories of what beauty is, Plotinus concludes that it is formal Unity. When diverse or similar parts are unified by one form, the Soul recognizes and takes pleasure in the form of Unity. This may happen when we view a painting or a sculpture, listen to a piece of music, or follow an elegant mathematical proof. In all these cases, we are drawn toward Unity, and the form of Beauty Itself. We must get there by stages: like people emerging from a dark cave into sunlight, we must become accustomed to the light. In the following passage, Plotinus combines ideas from Plato's allegory of the Cave with themes from the Symposium:

Like anyone just awakened the soul cannot look at bright objects. It must be persuaded to look first at beautiful habits, then the works of beauty produced not by craftsmen's skill but by the virtue of men known for their goodness, then the souls of those known for beautiful deeds . . . Only the mind's eye can contemplate this mighty beauty . . . So ascending, the soul will come to Mind . . . and to the intelligible realm where Beauty dwells" (9)

تھامس رِیڈ کے نزدیک حسن ایک مضوع شے ہے جو اظہار میں پوشیدہ ہوتی ہے۔

ولیم ٹامسن نے حسن کے چھے بنیادی اصول بیان کیے ہیں۔

ا۔ تناسب یا موزونیت کا حسن ب۔ شکل کا حسن

ج۔ خطوط کا حسن د۔ رنگوں کا حسن

ہ۔ بوقلمونی کا حسن و۔ لطافت کا حسن

ہر خوبصورت شے ان میں سے کسی ایک خصوصیت کی حامل ضرور ہوگی ورنہ وہ خوبصورت نہیں ہوگی اور جس میں یہ تمام

اوصاف موجود ہوں گے وہ درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہوگی۔

جمالیات کے حوالے سے جرمن فلاسفر Immanuel Kant, کا نام خاص اہمیت کا حامل ہے جس نے جمالیات کو ایک جداگانہ تجربے کے طور پر متعارف کرایا۔ Immanuel Kant نے اپنی کتاب Critique of Judgment میں جمالیات اور فنونِ لطیفہ کے حوالے سے خصوصی گفتگو کی ہے۔درج ذیل اقتباس دیکھیے:

"Since all fine art(indeed,all art in general) involves the concept of purpose,all beauty in fine art is fixed beauty and hence judgments about this beauty are "logically conditioned"(AK.312)because we are also judging how perfect the object is in terms of that purpose(AK.311).But although the artist is thus proceeding by an intention (the intention to produce an object in accordance with the concept he has of it) the intention must not show in the work :the work must look like nature even though we are aware that it is art (AK.306-07).In other words ,beauty in art is the same beauty as beauty in nature ,except that it is restricted to the concept of the things purpose.By the same token,nature is beautiful if it also looks like art:the beauty of nature is not fixed,however,because nature,as judged in aesthetic reflective judgments,only"look like" art,and we do not judge that it is art."(10)

کانٹ کا جمالیاتی نظریہ مکمل نہیں ہے۔اس کے باوجود وہ ایسا مفکر ہے جس نے اٹھارہویں صدی عیسوی کے علمائے جمالیات کو دعوتِ فکر کے ساتھ ساتھ جمالیاتی تصورات کو جدید رنگ روپ دینے کے لیے قابلِ قدر کام کیا۔اس کا کہنا ہے کہ حسن چاہے فن کی صورت میں ہو یا فطرت کی۔۔۔''اظہار'' ہوتا ہے اور اظہار تقریر کے مترادف ہے۔اس نے''اظہار'' کے تین لازمی عناصر بیان کیے ہیں: **لفظ، اشارت اور لہجہ**۔اسی لیے وہ لطیف فنون کو تقریر، صورت اور احساس انگیز تمثیل کے فنون میں تقسیم کرتا ہے اس نے فنونِ لطیفہ کی جمالیاتی قدروں میں شاعری کو پہلا درجہ دیا ہے۔

شلر حُسن کو ایسی تجریدی قوت قرار دیتا ہے جو حسیات سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔اس کے خیال میں حسن اپنی مطلق حیثیت میں حسیات سے بے نیاز ہوتا ہے لیکن اضافی حوالے سے حسیات کا پابند ہے۔اسی وجہ سے وہ حسن کو نہ تو مکمل معروضی سمجھتا ہے اور نہ ہی مکمل موضوعی۔اس نے اپنے تصورِ حسن کی بنیاد ایسی معروضیت پہ رکھی ہے جو ہمارے حواس و قلب سے تعلق رکھتی ہے۔ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کے بقول:

''میرے نزدیک شِلّر کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ اُس نے نہ صرف کانٹ کی موضوعیت کے نقص کو معلوم کر کے

معروضیت سے اسے دُور کرنے کی کوشش کی بلکہ تنہا معروضیت میں بھی اسی نقص کو محسوس کیا اور حُسن کا ایک ایسا معروضی نظریہ پیش کیا جو ایک اعتبار سے موضوعیت کا بھی حامل ہے۔''(۱۱)

گوئٹے نے فن کی صداقت, حسن اور کمال کو ہم آہنگ کرنے پر زور دیا ہے۔اُس کی رائے میں حسن, فن کو زندگی اور حرارت بخشتا ہے اور اعلیٰ وارفع فن میں لطافت پیدا کرتا ہے۔اسی طرح فن حسن کی اختلاط انگیز قوت کے ذریعے انفرادی بنتا ہے۔

کراوزے کی رائے میں کوئی بھی شے اس لیے خوبصورت ہوتی ہے کیونکہ وہ حقیقتاً ایسی ہی ہوتی ہے ۔فطرت کے ارتقائی مراحل میں حسن کا ایک ایسا سلسلہ موجود ہے جو خدا کے حسن تک پہنچ کر ختم ہوتا ہے اور یہ کہ ہمارے لیے وہی شے خوبصورت ہوتی ہے جو ہماری عقل کو فطرتی قانون کے مطابق موثر طریقے سے مشغول کرتی ہے اور ہمیں طمانیت عطا کرتی ہے۔

ہیگل فن کی افادی مقصدیت کا حامی ہے ۔اس کے خیال میں یہ بہت بری علامت ہے کہ کوئی فن کار زندگی کے مقصد کی بجائے مجرد تصورات کی خاطر اپنی تخلیقی فعلیت شروع کردے۔فن کا مقصد صداقت پیش کرنے میں ہی مضمر ہوتا ہے اور اس کے سوا ہر دوسرا مقصد کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

شیلنگ کی رائے میں حسن نہ محض عالم گیر ہے اور نہ ہی محض حق ہے ۔یہ ان دونوں کی جامع تفسیر ہے وہ صداقت، نیکی اور آزادی کو حسن کے مضمرات قرار دیتا ہے اور تصورات کو دیوتا قرار دیتا ہے جن کا جوہر اور قیام بالذات اللہ تعالیٰ کی مانند ہے۔ وہ تخیل کو ایسا ملکہ کہتا ہے جس کا عقل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور وہ واہمہ سے مختلف ہے۔اس نے تخیل کو فن کا عقلی وجدان قرار دیا ہے۔

شوپن ہار کے فلسفہ کے مطابق تمام جہان کُل کے ساتھ انفرادی ''ارادہ'' یا ''تصور'' کی معروضیت ہے ۔یہ تصور دیگر تمام تصورات سے ایسا تعلق رکھتا ہے جیسے ہم آہنگی ایک تفریدی یا اکیلے آہنگ سے۔ارادوں کی کشمکش سے نجات دلا کر بلند کرنے کی سب سے زیادہ قوت موسیقی میں پائی جاتی ہے ۔موسیقی دوسرے فنون کی طرح تصورات کی نقالی نہیں ہے بلکہ یہ خود ''ارادے'' کی نقالی ہے جو انسان کو ابدی، متحرک اور کوشاں ارادے دکھاتی ہے تاکہ وہ اپنی کوششوں کا ازسرِ نو آغاز کر سکے۔یعنی جس طرح موسیقی مختلف نغموں کی ہم آہنگی سے جمالیاتی حس کی تشفی کرتی ہے بالکل ویسے ہی فن کی ہر صنف اپنے عناصرِ ترکیبی کی وحدت سے ہمیں حظ پہنچاتی ہے۔

ہربرٹ اسپنسر انسانی چہرے کے حُسن کو اخلاقی نیکی کا اثر اور نشان قرار دیتا ہے۔اس کے نزدیک تخلیقی فعلیت جتنی کم سعی و کاوش کی مرہونِ منت اور جتنی برجستہ ہوگی ،اس میں اسی قدر زیادہ حسن ہوگا۔وہ جمالیاتی لذتوں کو تین اقسام میں بیان کرتا ہے۔**انفعالی، ادراکی اور جذباتی** ۔مکمل جمالیاتی لذت کی صورت وہ ہے جو ان تینوں اقسام کے باہمی اشتراک سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔

وائٹ ہیڈ کے نزدیک جب سچا حُسن، حقیقت کے ساتھ نمود کی مطابقت حاصل کرلے تو فن اپنے کمال تک پہنچ جاتا ہے ۔فن اگر حال کے نفع کی خاطر مستقبل کی حفاظت سے غفلت برتتا ہے تو اس رویے سے اس کا حسن کمزور ہوجاتا ہے لیکن بہرحال کسی فوری ماحاصل کا ہونا بھی ضروری ہوتا ہے اور کائنات کا مفاد غیر یقینی التوا میں مضمر نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر حسن کے حوالے سے کروچے کے خیالات کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''جس طرح حسن سے مراد کیف و سرُور کا کمال و اِتمام ہے' اُسی طرح اس کی ناتمامی قبح ہے ۔حُسن حظ انگیز ہے کیونکہ یہ ذات کا کامیاب اظہار ہے۔قبح اذیت انگیز ہے کیونکہ یہ ناکام اظہارِ ذاتی ہے ۔ سچی جمالیاتی لذت (یا حظ) دوسری لذتوں سے مختلف ہوتی ہے ۔یہ فن کار کی وہ لذت ہے جو اُسے اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ اپنے کام کو پہلی بار وجدانی طور پر دیکھتا ہے اور جب کہ اس کے تاثرات اظہار کے وسیلے سے صورت اختیار کر لیتے ہیں اور اس کا چہرہ خالقِ حقیقی کی اُلوہیتی خوشی کے ساتھ جگمگا اُٹھتا ہے۔''(۱۲)

ایم ایم شریف وحدت کو حسن کا ناگزیر عنصر قرار دیتے ہیں ۔ان کی رائے میں رنگ ہو یا نغمہ وہ اسی صورت میں دلکش ہوتا ہے اگر وحدت کی صفت کا حامل ہو۔ان کا کہنا ہے کہ حسن کی تخلیق میں ہماری کُل ذات شریک کار ہوتی ہے اور ہم ایک بچے کی طرح اپنے کُل کے ساتھ سوچتے اور تخلیقی عمل میں حصہ لیتے ہیں۔وہ کہتے ہیں:

''میرے نزدیک جمال نام ہے اس ترکیب یا تعمیر یا تشکیل کی ایک مخصوص صفت کا جو ایک خاص قسم کے معروض اور موضوع کی ایک خاص حالت کے باہمی ربط سے پیدا ہوتی ہے ۔معروض میں اتحاد' ہم آہنگی' وزن' جنسی یا جماعتی نشان وغیرہ میں سے کوئی نہ کوئی خصوصیت لازماً ہونی چاہیے اور موضوع میں دیگر باتوں کے علاوہ ہیجانات کا توازن حرکی لازمی ہے۔''(۱۳)

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے ایم ایم شریف کو نظریۂ وحدتِ جمال کا ایک شارح قرار دیا ہے۔(۱۴)

حُسن کا ایک اہم وصف مسرت پہنچانا بھی ہے۔کوئی تصویر دیکھ کر یا گانا سُن کر ہمیں جو مسرت حاصل ہوتی ہے وہ ظاہری حواس پر مبنی ہے اور اگر اس کا خارجی پہلو باقی نہ رہے تو مسرت کا وجود بھی باقی نہیں رہتا لیکن جس جمالیاتی مسرت کا تعلق ادبیات سے ہے وہ اُن سمعی یا بصری علامات کے سوا جو خیالات کو آنکھوں یا کانوں تک پہنچا دیں اور کسی خارجی تحریک پر مبنی نہیں ہوتی ۔وہ مسرت جو دوسرے لوگوں کے خیالات کے ذریعے یا خود ہمارے حافظہ اور تخیل کے ذریعے جذبات و حسیات کو متاثر کر کے پیدا ہوتی ہے''جمالیاتی ''مسرت کی اعلیٰ ترین صورت ہے۔ایسی مسرت خارجی اور مادی تحریک سے مبرّا ہوتی ہے اور جو فرد ایسی مسرت سے لطف اندوز ہوتا ہے وہ مسرت خود اس کی ملکیت ہے ۔ الغرض جمالیات، سیاسیات اور اخلاقیات سمیت مختلف موضوعات کی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ قرآن مجید: سجدہ۳۲:۷۔

۲۔ قرآن مجید: التغابن۶۴:۳۔

۳۔ قرآن مجید: النور۲۴:۳۵۔

۴۔ قرآن مجید: التین ۹۵:۴۔

۵۔ نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر: تاریخِ جمالیات، جلد اوّل، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۰ء، ص۴۳، ۴۴۔

۶۔ ممتاز حسین، سید: تنقیدی گوشے، آزاد کتاب گھر دلّی، ۱۹۶۴، ص۱۹۶۔

۷۔ ممتاز حسین، سید: تنقیدی گوشے، ص۱۹۷۔

۸۔ ممتاز حسین، سید: تنقیدی گوشے، ص۲۰۶۔

9. Bibliography: John Haldane, entry in A Companion to Aesthetics, ed. David Cooper, Blackwell, 1992, 1995,Page9.

10. Critique of Judgment, by Immanuel Kant,Translated by Werner s Pluhar,Hackett publishing company,Inc,Indiana,U.S.A,1987,Pagelxvii.

۱۱۔ نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر: تاریخ جمالیات'' جلد دوم، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۰ء، ص۶۹۔

۱۲۔ نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر: تاریخ جمالیات، جلد دوم، ص۴۱۴۔

۱۳۔ میاں محمد شریف: جمالیات کے تین نظریے، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۳ء، ص۱۸۷۔

۱۴۔ نصیر احمد ناصر، ڈاکٹر: تاریخ جمالیات، جلد دوم، ص۱۸۔

سید کامران عباس کاظمی
لیکچرر، شعبہ اُردو، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

اردو میں مضمون نگاری کی روایت

Some people are of the opinion that the trend of essay started in Urdu from the inspiration of English literature. In this article it is stated that Fort William College and Dehli College trained their pupils for writing Urdu essays. These two institution had an important role for promotion of Urdu litrecture.

جدید عہد میں بیشتر اصناف ادب انگریزی ادب کے ذریعے اردوادب میں روشناس ہوئی ہیں۔مضمون نگاری کے ضمن میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ اس صنف کا اردو زبان وادب میں فروغ انگریزی ادب ہی کا مرہونِ منت ہے۔اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں بطور صنف ادب مضمون کے آغاز وارتقا کا ایک جائزہ لے لیا جائے ۔مضمون نگاری(Essay) کا بانی ایک فرانسیسی ادیب مائیکل ایکوم ڈی مونٹین (Michel de Montaigne) کو قرار دیا جاتا ہے۔جس نے سب سے پہلے اپنے خیالات فنی پابندیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے آزادی سے تحریر کرنے کی کوشش کی۔اُس نے مضمون نگاری کا سلسلہ ۱۵۷۱ء میں آغاز کیا۔اُس کے مضامین کا پہلا مجموعہ ۱۵۸۰ء میں ''بورڈر'' سے جبکہ دوسرا مجموعہ ۱۵۸۸ء میں پیرس سے شائع ہوا۔جلد ہی مونٹین کے مضامین انگریزی زبان میں ترجمہ ہونے لگے ابتدائی تراجم اطالوی نژاد مترجم جان فلوریو (John Florio) نے کیے۔ان تراجم کے باعث اس نئی صنفِ ادب کو انگریزی زبان وادب میں بہت فروغ حاصل ہوا اور مانٹین کا انداز معروف ہونے لگا۔انگریزی ادب میں جس ادیب نے مضمون نگاری کا آغاز کیا وہ فرانسس بیکن (Francis Bacon) (۱۵۶۱ء۔۱۶۲۷ء) تھا۔ اُس کے مضامین کا پہلا مجموعہ ۱۵۹۷ء میں شائع ہوا اور بڑی سُرعت کے ساتھ مقبول ہوا۔فرانسس بیکن مضمون نگاری میں مونٹین سے متاثر تھا لیکن اس نے شروع سے ہی اپنا ایک الگ راستہ بنا لیا تھا۔

فرانسس بیکن کے عہد میں انگریزی ادب کے لیے معاشرتی اور سماجی مسائل کی اہمیت بڑھ گئی تھی۔یہی وجہ ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے مضمون نگاری کا ارتقاء ہوتا گیا اُس میں موضوعات کا معاشرتی حقائق سے ربط پیدا ہوتا گیا۔

مونٹین کی روایت کو آگے بڑھانے والے مضمون نگاروں میں ابراہم کاولی (Abraham Cowley) (۱۶۱۸ء۔۱۶۶۷ء) کا نام لیا جاتا ہے جس کے مضامین کا مجموعہ ۱۶۶۸ء میں شائع ہوا۔اُس کی زبان آسان اور سادہ ہے۔ اُس نے عالمانہ اسلوب کے بجائے انکشافِ ذات کو اہمیت دی ہے۔اُس کے خیالات فطری اور اُس کا اسلوب رواں ہے۔ ہمارے ہاں اردو میں انشائیہ کی جو ضروریات بیان کی جاتی ہیں ابراہم کاولی کی تحریروں میں وہ انداز دیکھا جاسکتا ہے۔

مغرب میں جب طباعت وصحافت کی سہولتیں بڑھنے لگیں تو مضمون نگاری کی صنف کو خاص طور پر بے حد مقبولیت حاصل ہوئی۔اس عہد میں مضامین لکھنے والے ادیبوں میں نمایاں حیثیت سر رچرڈ سٹیل (۱۶۷۲ء۔۱۷۲۹ء) کو حاصل ہے۔ اُنھوں نے پہلے اخبار ''ٹیٹلر'' اور بعد ازاں ''سپیکٹیٹر'' جاری کر کے مضمون نگاری کو روز مرہ زندگی کا حصہ بنا دیا۔ ان رسائل کی اشاعت سے قبل انگلستان میں عام زندگی کا ترجمان کوئی اخبار نہیں تھا۔ اٹھارویں صدی کے آغاز تک انگلستان میں سیاسی بیداری پیدا ہو چکی تھی۔لوگ شہری حقوق کے تصورات سے آگاہ ہو رہے تھے۔ جس کی وجہ سے پریس اور صحافت کا کردار بڑھ گیا تھا۔اخبارات و جرائد کا اس مخصوص عہد میں کردار ہی ایسّے (Essay) کے فروغ کا باعث بنا۔خاص قسم کے جریدی ایسّے (مضمون) کے فروغ میں ڈینیل ڈیفو (Deniel Dafoc) (۱۶۶۱ء۔۱۷۳۱ء) کا کردار کلیدی ہے بلکہ جریدی 'ایسّے' کا آغاز ہی ڈینیل ڈیفو سے ہوتا ہے گوکہ ڈیفو کی بنیادی شناخت ایک ناول نگار کی ہی ہے۔ بعدازاں اُس کے مضامین ٹیٹلر میں بھی شائع ہوتے رہے۔اس کے بعد رچرڈ سٹیل نے'' ٹیٹلر'' (TheTattler) (۱۷۱۱ء ۔۱۷۰۹ء) اور پھر جوزف ایڈیسن سے مل کر سپیکٹیٹر (Spectator) (۱۷۱۴ء۔ ۱۷۱۱ء) میں اس انداز کو فروغ دیا۔ بلکہ ان رسائل میں لکھے جانے والے مضامین کے اثرات جلد ہی سارے یورپ میں پھیل گئے۔

انگریزی مضمون نگاری کو فروغ دینے میں جن دوسرے مضمون نگاروں نے کلیدی کردار ادا کیا اُن میں سوفٹ (۱۷۴۵۔۱۶۶۷ء)، گولڈسمتھ (۱۷۲۸۔۱۷۷۴ء)، لی ہنٹ (۱۷۸۴۔ ۱۸۵۹ء) ،چارلس لیمب (۱۷۷۵ ۔۱۸۳۴ء) اور ولیم ہزلٹ (۱۷۷۸۔۱۸۳۰ء) شامل ہیں۔ اٹھارویں صدی میں انگریزی مضمون نگاری کو فروغ حاصل ہوا اور اس سے اُس عہد کے لکھنے والوں نے معاشرتی اصلاح کا خوب کام لیا۔انیسویں صدی میں مضمون نگاری کی صنف کو ان ادیبوں نے بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ اس سلسلے میں چارلس لیمب کا نام اور کام انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اُس کے مزاج کی سادگی نے اُس کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو اُس کی تحریر سے منعکس کیا ہے۔ ہمارے ادب میں آج جس 'انشائیہ' کا شوروغوغا ہے اُس کی بنیادوں کو درست کرنے میں چارلس لیمب نے ہی بنیادی کردار ادا کیا۔

انگریزی مضمون نگاری، جس کا آغاز دراصل فرانسیسی مضمون نگاری سے متاثر ہو کر ہوا، نے بہت جلد انگریزی ادب میں نمایاں مقام حاصل کر لیا۔اٹھارویں صدی میں جہاں مضمون نگاری کے ارتقاء میں نمایاں پیش رفت ہوئی وہیں اُس کی فنی ضرورتوں کا تعین بھی ہونے لگا۔انیسویں صدی میں مضمون نگاری میں خاصا عروج رہا اور ہر طرح کے موضوعات پر لکھے گئے مضامین کا ایک وافر ذخیرہ انگریزی ادب میں مہیا ہوا۔جلد ہی انگریزی مضمون نگاری کے اثرات باقی دنیا میں بھی پھیلنے لگے۔ برصغیر کی مخصوص سیاسی سماجی فضا میں بھی مضمون کا آغاز انگریزی مضمون نگاری کے تتبع میں ہی ہوا۔

اردو میں مضمون نگاری کی ایک صورت ابتداء میں ہمیں صوفیا کی نثری تحریروں میں بھی دکھائی دیتی ہے جنھوں نے رشد و ہدایت کی خاطر رسائل لکھے جن کے ذریعے تصوف کی تعلیم دینا مقصود تھا۔اُن صوفیا کی تحریروں کو کئی اسباب سے باقاعدہ مضمون قرار نہیں دیا جاسکتا۔ پہلا سبب تو یہی ہے کہ زبان ابھی اپنی ابتدائی شکل میں تھی اور دوسرا سبب یہ ہے کہ صوفیائے کرام مضمون کی تکنیک سے آشنا نہیں تھے لیکن چونکہ کوئی نہ کوئی موضوع اُن کے پیشِ نظر رہتا تھا جس کی ایک علمی سطح تھی علاوہ ازیں قلبی اور باطنی مسائل کو بیان کرنے کے لیے وہ دلچسپی کے عنصر کو بھی پیشِ نظر رکھتے تھے لہٰذا ایک حد تک ہم اُن کی تحریروں کو بھی مضمون کی ابتدائی شکل کہہ سکتے ہیں۔ اردو نثر کے یہ ابتدائی نمونے اِنہی صوفیا کے ملفوظات پر مشتمل ہیں۔ڈاکٹر شہناز انجم اردو نثر کے آغاز و ارتقا کو اِن صوفیا سے

منسوب کرتے اور سراہتے ہوئے کہتی ہیں ''سچ تو یہ ہے کہ اردو نثر کے ارتقا میں اِن صوفیوں، رشیوں اور بھگتوں کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ جنھوں نے اسے اپنے خیالات کی ترسیل کا اہم ذریعہ بنایا''[1] اُردو نثر کا آغاز و ارتقاء شمالی ہند کے بجائے جنوبی ہند اور خصوصاً دکن کی سر زمین سے ہوا۔ دکن میں ہی بعد ازاں مربوط نثر کے نمونے بھی ملتے ہیں۔ آٹھویں صدی ہجری سے لے کر تقریباً گیارویں صدی ہجری تک جنوبی ہند میں اردو نثر میں بہت سے مذہبی رسائل اور تصنیفات ملتی ہیں جنھوں نے اردو نثر کے ارتقا میں بنیادی کردار ادا کیا۔ علاوہ ازیں دکن کے مخصوص سیاسی و جغرافیائی حالات بھی اردو زبان کے حق میں سود مند ثابت ہوئے اور اردو نظم و نثر کے ایک وافر ذخیرے کا سبب بنے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اِن مذہبی تالیفات میں ''معراج العاشقین'' کو اولیت حاصل ہے۔

ملا اسد اللہ وجہی (م ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء) کی مشہورِ زمانہ تصنیف، سب رس، تک اردو نثر کا ارتقاء متواتر ہوتا رہا۔ تاہم زیادہ تر تالیفات مذہبی نوعیت کی ہی تھیں اور اگر کچھ کتب مذہبی موضوعات سے ہٹ کر لکھی بھی گئیں تو بھی اُن کا غالب عنصر مذہب ہی ہے۔

اُس عہد کی زبان پر فارسی زبان کا غلبہ تھا۔ تاہم اُن تالیفات کو مضمون کے ذیل میں اس لیے بھی نہیں رکھا جاسکتا کہ اُن تحریروں میں کسی خاص طوالت کا خیال بھی نہیں رکھا گیا نہ ابھی زبان کے قواعد کے کوئی خاص اصول مقرر ہوئے تھے۔ ابھی اردو نثر ارتقا کے مدارج طے کر رہی تھی تاہم اُردو میں جملہ بنانے کی ساخت میں وہی انداز ہے جو فارسی نثر میں ملتا ہے۔ مسجع و مقفیٰ نثر کا رواج عام تھا۔

دکنی روایت میں پنپتی ہوئی روز مرہ زبان کی روایت جلد ہی فارسی نثر کے اسلوب سے متاثر ہوگئی اور اردو نثر نگار عبارت آرائی، قافیہ پیمائی، تشبیہ و استعارہ اور دیگر صنائع لفظی و معنوی یعنی تجنیسی ایہام، رعایت لفظی اور مبالغہ آرائی کو ضروری خیال کرنے لگے۔ گویا جو خامیاں فارسی نثر میں تھیں وہ اردو نثر میں بھی در آئیں۔

صوفیا کا تذکرہ ابتدا میں صرف یہ دیکھنے کے لیے کیا گیا ہے کہ انگریزوں کی آمد سے قبل قدیم عہد میں علمی موضوعات پر ایسی تحریریں لکھنے کا آغاز ہو چکا تھا جنھیں ہم کسی نہ کسی سطح پر مضمون تصور کر سکتے ہیں۔ البتہ ایسے مضامین جو مغرب کی دی گئی تعریف پر پورا اترتے ہوں اُن کا آغاز دلی کالج (قیام ۱۸۲۵ء) سے ہوا۔

درحقیقت فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے قیام (۱۸۰۰ء) کے ساتھ ہی ہندوستان میں عربی و فارسی زبان و ادب کی اہمیت کم ہونے لگی تھی اور اُس کی جگہ آہستہ آہستہ انگریزی زبان و ادب کے اثرات بڑھنے لگے تھے۔ اٹھارویں صدی کے آخر تک شعری اصناف کے مقابلے میں نثر میں زیادہ تازگی اور قوت نمو کا احساس ہوتا تھا اور اَب اُسے عربی فارسی سہارے کی تلاش نہیں تھی۔ اُس عہد کی نثری اصناف کا فروغ یا تو مصنفین کی انفرادی کوششوں کا ثمر تھا یا پھر اُنھیں مغربی ادب سے اخذ و استفادہ کیا گیا تھا۔ اردو کی جدید نثری اصناف میں عربی فارسی زبان و ادب کی خصوصیات اس قدر نہیں پائی جاتیں جتنا کہ شعری اصناف میں موجود ہیں۔

کسی بھی صنفِ ادب کا ابتدائی دور فنی حوالوں سے تجرباتی دور ہوتا ہے اور اُس میں فنی پختگی نسبتاً نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ بعینہ اردو ادب میں بھی مغرب سے آنے والی اصناف مثلاً ناول، افسانہ، ڈرامہ اور تنقید وغیرہ کی ابتدائی شکلیں ناپختہ نہ سہی البتہ فنی حوالوں سے کمزور ضرور ہیں تاہم اس ضمن میں مضمون کو استثنا حاصل ہے۔ موضوعاتی سطح پر ابتدائی مضمون نگاروں نے اپنے

مضامین کے موضوعات میں مغربی مضامین سے استفادہ کیا مگر بطورِ صنف ادب مضمون نگاری میں اُس عہد کے مضمون نگاروں نے اپنی مہارت کا ثبوت بہم کیا ہے۔

اس دوران سوداؔ کے نثری دیباچہ کی اہمیت یہ ہے کہ اُس کا موضوع مذہبی نہیں ہے تاہم سوداؔ کی زبان پر عربی و فارسی اثرات گہرے ہیں۔تشبیہ،استعارہ اور قوافی کے التزام نے عبارت کو دقیق بنا دیا ہے۔ البتہ اُن کے لہجہ میں تسلسل و روانی ہے۔''۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں جان گلکرسٹ کی کوششوں سے سلیس اردو نثر کا آغاز ہوا۔'' [۲] اسی کالج نے اردو نثر کے خالی دامن کو علمی و ادبی موضوعات سے بھی نوازا ہے۔گلکرسٹ کو اس امر کا شدت سے احساس ہوا کہ اردو زبان میں آسان،سلیس اور مفہوم کے اعتبار سے سمجھ میں آنے والی نثری کتابیں موجود نہیں ہیں۔لہٰذا گلکرسٹ کے ایما پر فورٹ ولیم کالج میں سادہ اور آسان زبان میں کافی تعداد میں کتابیں ترجمہ کی گئیں۔جن میں سب سے اہم کام میر امن دہلوی نے انجام دیا۔البتہ کالج میں انگریزی اثرات کے تحت رائج سادہ اور سلیس نثر کے ردِعمل میں کالج سے باہر وہی پرانی عبارت آرائی اور نمائشی نثر کا رواج موجود رہا۔جیسا کہ مرزا رجب علی بیگ سرورؔ کی کتاب ''فسانہ ء عجائب'' کی عبارت مقفیٰ اور مسجع ہے اور اسے خود سرورؔ نے ''باغ و بہار'' کی زبان کے ردِعمل میں لکھا۔''باغ و بہار'' قصے کے آغاز میں لکھا گیا میر امنؔ کا مقدمہ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ اردو مضمون نگاری کا، جو انگریزی اثرات کے زیرِ اثر بعد ازاں آغاز ہوتی ہے، نقطۂ آغاز ہے کیونکہ اُس میں مضمون کی دیگر خصوصیات بہم نہیں ہیں ۔ البتہ اُس کی نثر سادہ اور آسان ہے۔تاہم اردو نثر کے فروغ میں اس قصہ اور قصہ کے آغاز میں مقدمہ کی زبان آئندہ فروغ پانے والی زبان کا نقطۂ آغاز ہے۔اردو نثر میں سادہ نثر اور روز مرہ کی زبان کا فروغ فورٹ ولیم کالج سے ہوتا ہے۔ البتہ میر امن کے مقدمہ میں مضمون نگاری کے اثرات موجود ہیں۔''فسانہء عجائب'' کے مقدمہ کی زبان وہی ہے جو سرورؔ نے قصے میں استعمال کی ہے یعنی مقفیٰ و مسجع عربی فارسی الفاظ کی آمیزش سے پر تصنع زبان ۔البتہ دیباچے میں سرورؔ نے لکھنو کی تہذیب کا جو مرقع پیش کیا ہے اس میں مضمون نگاری کے ابتدائی نقوش تلاش کیے جاسکتے ہیں۔اس کے علاوہ فقیر محمد گویاؔ نے ''بستانِ حکمت'' میں جو دیباچہ لکھا ہے اُس میں بھی مضمون نگاری کے ابتدائی نقوش ملتے ہیں۔

اردو میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز دلی کالج سے ہوتا ہے۔فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کو سادگی اور سلاست سے آراستہ کیا مگر کالج کا بیشتر کام افسانوی ادب سے متعلق تھا۔اردو کا دامن اب بھی علمی موضوعات کی حامل تحریروں سے تہی تھا اور یہ کام دلی کالج نے کیا۔دلی کالج کا بنیادی مقصد جدید سائنسی خطوط پر ہندوستانیوں کو جدید علوم کی تعلیم سے بہرہ مند کرنا تھا۔دلی کالج سے اردو زبان میں پہلی بار سائنسی علوم پر مشتمل کتابیں ترجمہ ہو کر شائع ہونے لگیں۔مولوی عبدالحق نے اپنی تصنیف ''مرحوم دلی کالج'' میں ایسی تمام کتب کی فہرست دی ہے۔ خالص علمی نثر اور جدید مضمون نگاری میں سلیس نثر کا فروغ اسی دلی کالج کی دین ہے۔اس کالج کے نمایاں اساتذہ میں ماسٹر رام چندرداس اور طالب علموں میں مولوی ذکا اللہ،مولوی محمد حسین آزادؔ،مولوی نذیر احمد ، مولوی احمد علی وغیرہ شامل ہیں۔ دلی کالج میں طلبہ کو جدید مضمون نگاری سے روشناس کرانے کے لیے باقاعدہ مضمون نگاری کے مقابلے ہوتے تھے اور ایک پرچہ امتحانات میں مقالہ نگاری کا بھی ہوتا تھا۔ مثلاً ۱۸۴۶ء کے امتحان میں مقالہ نگاری کے پرچے کے لیے عنوان مقرر کیا گیا تھا۔''بالائی (شمالی) ہندوستان پر ریلوے کے جاری ہونے سے کیا اخلاقی اثر پڑے گا'' اور مولوی محمد حسین آزاد کو اس موضوع پر

بہترین مقالہ لکھنے پر طلائی تمغہ سے نوازا گیا تھا۔[۳]

اردو مضمون نگاری جس کا آغاز دلی کالج سے ہوتا ہے اُس کے اولین مضمون نگار ماسٹر رام چندر تھے۔ اردو مضمون نگاری کی ایک اہم محقق سیدہ جعفر کا کہنا ہے۔''رام چندر اردو کے وہ پہلے مصنف ہیں جنھوں نے مغربی ادبیات سے متاثر ہو کر اُن کی جاندار ادبی روایات اور توانا ادبی قدروں کو اپنانے اور اُنھیں اردو زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی۔''[۴] ڈاکٹر سیدہ جعفر کے اس نظریے سے، کہ رام چندر اردو کے اولین مضمون نگار ہیں، قبل تمام محققین اس امر پر متفق تھے کہ سر سید احمد خاں اردو کے پہلے مضمون نگار ہیں۔خود سرسید کا بھی یہی خیال تھا کہ مضمون نگاری جو اردو میں نہ تھی اُن کی ایجاد ہے۔''اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا کیا طرز ہے اور ہماری اردو زبان میں اُن خیالات کو ادا کرنے کی کیا کچھ طاقت ہے۔''[۵] سرسید کے ایک مداح اور محقق ڈاکٹر سید عبداللہ کا کہنا بھی یہی ہے کہ''اردو میں مضمون نگاری کی صنف کے بانی سرسید ہی تھے۔''[۶] ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار جنھوں نے تہذیب الاخلاق سے منتخب مضامین مرتب کیے وہ بھی سرسید کی اولیت کے قائل ہیں۔اُن کا کہنا ہے کہ''اردو ادبیات میں مضمون نگاری انگریزی ادبیات کے زیرِ اثر انیسویں صدی میں شروع ہوئی اور سر سید احمد خاں اردو میں اس صنف کا باقاعدہ آغاز کرنے والے تھے۔''[۷] اردو زبان و ادب کے ایک اور اہم محقق ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بھی اسی خیال کے حامی نظر آتے ہیں کہ مضمون نگاری میں سرسید ہی کو تقدم حاصل ہے''اردو میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز سرسید احمد خاں سے ہوا۔اُنھوں نے مذہبی، سیاسی، ادبی، علمی، معاشرتی، تاریخی، فلسفیانہ اور دیگر موضوعات پر بکثرت مضامین لکھ کر ہم عصر ادیبوں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔''[۸] اردو کے بیشتر ناقدین مضمون نگاری میں سرسید ہی کی اولیت کے قائل ہیں۔ڈاکٹر حامد حسن قادری بھی سرسید ہی کو مضمون نگاری کا پیش رو سمجھتے ہیں۔

درج بالا تمام اقتباسات اردو کے ثقہ بند نقادوں اور محققوں کے ہیں اور جو بات سمجھ نہیں آتی وہ یہ ہے کہ ان دانشوروں کی نظروں سے دلی کالج کی خدمات کیسے اوجھل ہو گئیں۔کیونکہ اگر وہ مضمون نگاری کے فروغ میں دلی کالج کی خدمات کا جائزہ لیتے تو یقیناً سیدہ جعفر سے قبل ہی دلی کالج کے مضمون نگاروں سے وہ تمام آگاہ ہو جاتے اور اگر اُنھوں نے مثلاً ڈاکٹر غلام حسین نے، سیدہ جعفر کے نقطۂ نظر سے اتفاق بھی کیا ہے تو ماسٹر رام چندر کو علمی مضمون نگار اور سرسید احمد خاں کو ادبی مضمون نگار قرار دے کر اولیت کا تاج بہر حال سرسید کے ہی سر سجانے کے خواہش مند نظر آئے ہیں۔[۹]

ڈاکٹر سیدہ جعفر مضمون نگاری میں سرسید کے تقدم کی قائل نہیں ہیں اور انہوں نے تحقیق سے یہ بات ثابت کی ہے کہ اردو کے اولیں مضمون نگار ماسٹر رام چندر ہیں۔سیدہ جعفر اس امر پر حیرت کا اظہار کرتی ہیں کہ اردو کے محققین کیسے رام چندر کی تحریروں کو نظر انداز کر گئے اور خود سرسید بھی یہی سمجھتے رہے کہ وہ مضمون نگاری کے مؤجد اول ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ سرسید دلی کالج کی علمی سرگرمیوں سے آگاہ نہیں تھے اور نہ اُن کی دسترس ماسٹر رام چندر کے جاری کردہ جرائد تک تھی۔ممکن ہے سفرِ انگلستان سے پہلے سرسید کے لیے مضامین کی یہ نئی طرز کوئی اہمیت نہ رکھتی ہو اور انگلستان جا کر اُن پر یہ عقدہ کھلا ہو کہ''لنڈن کے پیغمبروں اور سولائزیشن کے دیوتاؤں سر رچرڈ اسٹیل اور مسٹر اڈیسن'' کے مضامین کی طرز پر ہندوستان میں بھی مضامین لکھ کر کوئی سماجی تبدیلی پیدا کی جاسکتی ہے۔چونکہ سفرِ انگلستان سے قبل کی سرسید کی تالیفات فارسی آمیز طرز نگارش لیے ہوئے ہیں۔

رام چندر وہ پہلے ادیب ہیں جنھوں نے انگریزی ادب سے متاثر ہو کر انگریزی کے طرز پر مضامین لکھنے کی کوشش

کی۔چنانچہ اُن کے مضامین اور اُن کے رسالے''فوائد الناظرین''پر تبصرہ کرتے ہوئے گارساں دتاسی نے لکھا تھا۔فوائد الناظرین۔۔میں علاوہ خبروں کے مضمون بھی چھپتے ہیں جو انگریزی ذرائع سے ماخوذ ہیں۔[۱۰]

اس طرح سرسید کا یہ کہنا کہ اُنھوں نے انگریزی مضمون نگاری سے استفادہ کرتے ہوئے اردو میں مضمون نگاری کی نئی طرز ایجاد کی، درست نہیں لگتا۔کیونکہ اُن سے بہت پہلے رام چندر انگریزی مضمون نگاری سے متاثر ہو کر ہی مضمون لکھ رہے تھے۔دہلی کالج کی نثری خدمات اور اردو مضمون نگاری کا تذکرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی بھی رام چندر کو اردو کا پہلا مضمون نگار قرار دینے میں سیدہ جعفر کے ہم خیال نظر آتے ہیں:

> اردو میں مقالہ نگاری کا آغاز ۱۸۴۵ء کے آس پاس ہو چکا تھا مگر اس کی مقبولیت کا عہد ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا۔دلی کالج کے نصاب میں مختلف مضامین شامل تھے۔امتحان کے پرچوں میں ایک پرچہ مقالہ نگاری سے متعلق ہوا کرتا تھا۔۔۔امتحان کے پرچوں میں مضمون نویسی کے علاوہ سالانہ مضمون نویسی کا مقابلہ بھی ہوا کرتا تھا۔۔۔ ان انگریزی او ر اردو انعامی مقابلوں میں طلائی اور نقرئی تمغے دیے جاتے تھے ان مقابلوں میں انعام پانے والوں میں مفتی صدر الدین آزردہ نے بھی اردو میں بہترین مقالے کے لیے ایک طلائی تمغہ حاصل کیا تھا۔دیگر انعام پانے والوں میں ماسٹر رام چندر، موتی لال، مولوی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، ذکاء اللہ، بھگوان داس، خواجہ ضیاء الدین خصوصیت رکھتے ہیں۔[۱۱]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دلی کالج میں اردو مضمون نگاری کے فروغ کے لیے ہر طرح کے وسائل کا استعمال کیا جاتا تھا۔بہترین مضامین پر طلبہ کو انعامات بھی دیے جاتے تھے، تاکہ مضمون نگاری کا شوق طلبہ میں اُبھارا جا سکے۔ رام چندر پہلے دہلی کالج میں پڑھتے رہے اور بعد ازاں اُسی کالج میں حساب و الجبرا (Math) کے استاد مقرر ہوئے۔مولوی نذیر احمد، مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی ذکاء اللہ اُن کے شاگرد تھے۔ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی بھی رام چندر کو اردو کا پہلا مضمون نگار قرار دیتے ہیں۔اُن کا کہنا ہے:

> اردو نثر کی تاریخ میں ماسٹر رام چندر کی اولیت اور قدامت مسلّم ہے کہ اُنھوں نے علمی، تاریخی، معاشرتی اور سائنسی موضوعات پر سب سے پہلے مختصر مقالات Essay لکھے۔ اردو مضامین کے ذریعہ سائنسی نقطۂ نظر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جدید تہذیب کی برکتوں سے لوگوں کو روشناس کرایا۔اور مشرق و مغرب کی اعلیٰ اقدار میں امتزاج پیدا کیا۔[۱۲]

ماسٹر رام چندر نے نہ صرف یہ کہ علمی و سائنسی مضامین کالج کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ترجمہ کیے بلکہ کافی تعداد میں طبع زاد مضامین بھی لکھے۔چونکہ کالج کی درسی زبان اردو تھی سو یہ تراجم اور طبع زاد مضامین بھی اردو میں ہی تھے۔

مضمون نگاری کے ارتقاء میں طباعت کی سہولتوں اور صحافت کے آغاز کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ طباعت عام ہونے سے مختلف اخبار و جرائد کا آغاز ہوا۔طباعت کی اِن سہولتوں کا سب سے زیادہ فائدہ صحافت کو ہوا۔۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے اردو زبان کا پہلا اخبار''جامِ جہاں نما'' جاری ہوا جبکہ دہلی سے ۱۸۳۷ء میں مولوی محمد باقر کا''اردو اخبار''(جس میں مولانا آزاد کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا، مولوی محمد باقر، آزاد کے والد تھے'') اور سید محمد کا''سید الاخبار''(جس میں سرسید کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا۔سید محمد سرسید

کے بڑے بھائی تھے) جاری ہوئے۔

ماسٹر رام چندر کا ایک پندرہ روزہ جریدہ ''فوائد الناظرین'' ۱۸۴۵ء میں جاری ہوا جبکہ ایک ماہوار رسالہ ''خیر خواہ ہند'' کے نام سے ستمبر ۱۸۴۷ء میں انہوں نے جاری کیا اور اس کا نام نومبر ۱۸۴۷ء میں بدل کر ''محبّ ہند'' رکھ دیا۔ ''یہ اردو کا پہلا علمی و ادبی رسالہ تھا جو کم و بیش پچاس صفحات پر مشتمل ہوتا تھا۔''[۱۳] رام چندر کے دونوں پرچے ۱۸۵۵ء میں بند ہو گئے۔ ''محبّ ہند'' ہندوستان میں اردو زبان کا پہلا ادبی رسالہ ہے۔ یقیناً اس میں ادبی مضامین ہی شامل ہوا کرتے تھے۔

سرسید احمد خاں نے اپنے بھائی سید محمد کے اخبار ''سید الاخبار'' سے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز کیا۔ چونکہ اُس اخبار کی فائل موجود نہیں ہے اس لیے یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ اُس اخبار میں شائع ہونے والی سرسید کی تحریریں کس نوعیت کی تھیں۔ تاہم سرسید کے سفرِ انگلستان سے قبل کی تحریروں سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اُن کا اسلوب یا طرزِ نگارش روایتی فارسی آمیز ہی ہوگا اور پھر وہ تحریریں صحافتی نوعیت کی ہوں گی۔ تاہم سرسید کی باقاعدہ مضمون نگاری کا آغاز رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' سے ہوتا ہے۔ ''محبّ ہند'' کے اجراء کے ۲۳ سال بعد ۱۸۷۰ء میں سرسید احمد خاں سفر انگلستان سے واپسی پر ''تہذیب الاخلاق'' جاری کرتے ہیں۔

ماسٹر رام چندر کے مضامین میں عقلیت پسندی کا غلبہ ہے۔ اپنے عہد کے سیاسی سماجی حالات ورجحانات کی تصویریں ہیں۔ ماسٹر رام چندر نے تقریباً چار سو سے زائد مضامین لکھے۔ ان میں تاریخ، جغرافیہ، کیمیا اور دیگر سائنسی موضوعات پر بھی تحریریں شامل ہیں۔ اُن کے مضامین کی زبان سادہ ہے مگر جملوں کی ساخت قدرے نامانوس لگتی ہے۔ اُن کی نثر میں شگفتگی بھی کم ہے اور مضمون لکھنے کا انداز بھی خاصا رسمی ہے۔ رام چندر کے مضامین کا بنیادی مقصد سماجی اصلاح تھا۔ انہوں نے اخلاقی و اصلاحی موضوعات کو علمی انداز میں پیش کیا ہے۔ شاید وہ ادبی اور علمی انداز میں کوئی تفریق نہیں برتتے تھے چونکہ اردو مضمون نگاری کا آغاز ہی رام چندر سے ہوتا ہے اور اُن کے سامنے کوئی روایت موجود نہ تھی۔

اس عبوری عہد میں رام چندر سے توقع رکھنا کہ وہ خالصتاً ادبی مضامین لکھتے عبث ہے۔ ادبی چاشنی سے تو سرسید کے مضامین بھی عاری ہیں حالانکہ دہلی کالج کے طفیل اردو نثر میں مضمون نگاری کی مستحکم روایت قائم ہوچکی تھی۔ اس امر کی وضاحت پہلے کی جا چکی ہے کہ سرسید نے دہلی کالج میں رائج مضمون نگاری سے کوئی استفادہ نہیں کیا یا پھر اُس کا ذکر نہیں کیا۔ تاہم اردو مضمون نگاری میں سرسید کی اہمیت مسلّم ہے۔ سرسید نے مضمون نگاری میں اہلِ قلم اور اہلِ علم افراد کی ایک ہنرمند جماعت تیار کردی تھی۔ سرسید کی تصنیفی زندگی کا آغاز تقریباً ۱۸۳۸ء میں ہوا۔ ۱۸۶۹ء میں وہ انگلستان گئے اور وہاں تقریباً ڈیڑھ برس رہے۔ وہاں اُنھوں نے اسٹیل اور ایڈیسن کے رسائل کا مشاہدہ کیا اور اُن کی معاشرتی، اصلاحی خدمات سے بہت متاثر ہوئے۔ سرسید نے بھی اپنے مضامین میں قوم کے اصلاحی مقاصد کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ یعنی وہ ادب کے سماجی کردار کے قائل تھے۔ ڈاکٹر سلیم اختر کا خیال ہے کہ ''سرسید احمد خاں اردو کے پہلے ادیب ہیں جنہوں نے ادب برائے مقصد کا پرچار کیا اور خوب کیا۔''[۱۴] سرسید کے بہت بعد میں ترقی پسند تحریک نے ادب برائے زندگی کا منشور دیا گویا ادب میں مقصدیت کی داغ بیل سرسید ہی نے ڈالی تھی اور اس مقصد کے لیے اُنھوں نے نہ صرف یہ کہ خود لکھا بلکہ اپنے رفقائے کار سے بھی لکھوایا۔ سرسید کے مضامین کو ڈاکٹر غلام حسین نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔مذہبی ۲۔تعلیمی و سیاسی وغیرہ ۳۔معاشرتی مسائل،مجلسی آداب وتہذیب الاخلاق۔تیسری قسم کے مضامین ادبی نقطۂ نظر سے قابلِ ذکر ہیں۔پہلی اور دوسری قسم کے مضامین کو علمی کہا جاسکتا ہے ادبی لحاظ سے اُنھیں زیرِ بحث لانا سعی لا حاصل ہے۔[۱۵]

سرسید کے بعض مضامین میں اختصار،ناتمامی اور جزویت مضمون نگاری کے معیار کے مطابق ہیں البتہ ان مضامین میں کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں کو زیرِ بحث لانے کے بجائے کسی ایک پہلو پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے۔سرسید کے اکثر مضامین باقاعدہ ادبی مضامین کی صف میں شمار نہیں ہوتے کیونکہ اُن کے ہاں خیال انگیزی کا عنصر کم ہے اور مصنف اور قاری کے مابین بے تکلفی اور اعتماد کے ماحول کے بجائے سرسید سماج کو ہر قیمت پر اپنی اصلاح پسندی کا قائل کرنا چاہتے ہیں۔وہ ایک مصلح ہیں وہ ایک معلمِ اخلاق ہیں جو دلائل و براہین سے مخاطب ذہنوں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔دلوں کو تسخیر کرنے کے لیے ادیب کے نقطۂ نظر کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔سرسید کے مضامین پر ڈاکٹر سید عبداللہ کی رائے ایک متوازن رائے ہے:

باایں ہمہ سید صاحب کے اکثر مضامین میں بعض کمزوریاں پائی جاتی ہیں جن کے سبب اُن کو معیاری مضامین کی صف میں جگہ نہیں دی جاسکتی۔اوّل تو اُن کے تمام مضامین طویل ہوتے ہیں پھر اُن میں علمی و اصلاحی معلومات کی بھر مار اس قدر ہوتی ہے اور منصوبہ بندی اتنی سخت ہوتی ہے کہ مضمون پُر لطف نہیں رہتے۔علمی مقالات یا علمی بحث کے اعتبار سے ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔مگر مضمون کی سی شگفتگی ان میں نہیں پائی جاتی۔اس کے علاوہ سرسید کے مضامین میں بے حد سنجیدگی پائی جاتی ہے۔اکثر مضامین میں اُن کی حیثیت معلمِ اخلاق کی ہے ادیب کی نہیں۔[۱۶]

اردو نثر میں جدید علمی و ادبی مضمون نگاری کے فروغ میں سرسید کا کردار بہت اہم ہے۔سرسید نے اردو نثر کو اس قابل بنایا کہ اس میں ہر طرح کے موضوعات کو ادا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی۔سرسید نے تو اردو مضمون نگاروں کا ایک ایسا گروہ تشکیل دے دیا تھا جو اُن کے اصلاحی مقاصد سے ہم آہنگ تھا۔اردو مضمون نگاری میں تیسرا اہم نام مولوی محمد حسین آزاؔد کا ہے۔آزاؔد کی تصنیفی زندگی کا آغاز مولوی محمد باقر کے اخبار ''سید الاخبار'' (اجراء ۱۸۳۷ء) سے ہوا۔البتہ اُن کا پہلا باقاعدہ مضمون دہلی کالج کے مضمون نویسی کے مقابلے میں شامل تھا۔یہ مضمون ۱۸۴۸ء میں لکھا گیا اور اسے بہتر مضمون خیال کیا گیا جبکہ اگلے سال آزاؔد نے ''اسلامی اور انگریزی حکومتوں کے تحت آزادیٔ رعایا کے بارے میں کیا فرق تھا؟ کے زیرِ عنوان مضمون لکھ کر طلائی تمغہ حاصل کیا۔[۱۷] آزاد کی مضمون نگاری کے بارے میں ڈاکٹر سیدہ جعفر کی رائے نہایت جامع ہے:

آزاد کا طرز نگارش قدیم اور جدید دونوں اسالیب کا ایک خوشگوار اور حسین امتزاج ہے۔آزاؔد مغرب کی ترقی،اُس کی مادی اور ادبی برتری سے متاثر ضرور تھے لیکن جس ماحول میں اُن کے مزاج اور ذہن نے نشو و نما پائی تھی وہ مشرقی تھا۔اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزاؔد کے اسلوب میں جدت طرازی انفرادیت اور ایک نئی لے کے باوجود مشرقی انشاپردازی کے قدیم معیاروں سے وابستگی اور استعارات کی دلکشی،اُن کا برجستہ استعمال،الفاظ کا ترنم اور مرکبات کی جھنکار اور انشا پردازی کی صوتی قدریں موجود تھیں۔سادگی و پرکاری،انداز کا تیکھا پن اور مٹھاس تھی۔اس طرح آزاؔد کا اندازِ بیان مشرقی و مغربی انشا پردازی کا ایک نیا سنگم بن گیا۔[۱۸]

آزاد کے مضامین میں اختصار اور جامعیت ہے۔اُن کا اسلوب سحر انگیز ہے اگر چہ آزاد کے اکثر مضامین ایڈیسن اور جانسن کے بعض مضامین کا آزاد ترجمہ ہیں(بالخصوص ''نیرنگ خیال'') جس کا اعتراف خود آزاد کو بھی ہے۔تاہم ترجمہ و استفادہ کے اس عمل میں اُنھوں نے مشرقیت کو برقرار رکھا۔آزاد کا اسلوب سب سے جدا ہے۔قدیم و جدید ادب کے گہرے مطالعے نے اُن کے موضوعات کو وسعت اور اُن کے اسلوب کی سحر انگیزی کو بڑھا وا دیا ہے۔اردو مضمون نگاری کے فروغ میں رفقائے سرسید نے بنیادی کردا ادا کیا۔''تہذیب الاخلاق'' کے اجراء کے بعد اگلے تیس برس رفقائے سرسید کا ہی دور رہا۔رفقائے سرسید میں مولوی نذیر احمد،علامہ شبلی نعمانی، مولوی ذکا اللہ،مولوی چراغ علی، الطاف حسین حالی،محسن الملک اہم ہیں۔

مولوی ذکا اللہ بھی دہلی کالج میں ماسٹر رام چندر کے شاگرد رہ چکے تھے۔۱۸۹۱ء میں اُنھوں نے ''محاسنِ اخلاق'' کے نام سے ایک مجموعۂ مضامین شائع کرایا تھا جس میں۲۵ ۷ کے قریب مضامین شامل تھے۔جن میں سے اکثر انگریزی مصنفین کے مضامین سے ماخوذ تھے۔مولوی ذکا اللہ بھی سرسید کے افادی و مقصدی ادب کی تحریک کے حامیوں میں سے تھے۔اُن کے اپنے خیال میں بھی مضمون کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس میں کوئی نہ کوئی سنجیدہ مقصد ہونا چاہیے۔ذکا اللہ کے مضامین کے موضوعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے سماجی اور ادبی تقاضوں کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ سادگی،سلاست،اختصار،عربی وفارسی ثقیل مرکبات سے بچنے کا رویہ اور منطقی حدود کے اندر رہنے کی کوشش اُن کے مضامین کے نمایاں اوصاف ہیں۔مولوی چراغ علی کے مضامین میں مناظرے کا سا انداز ہے۔''واقعات کی تنقید اور اُن کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کر کے صحیح نتائج کے استخراج کرنے کا اُنھیں خاص سلیقہ تھا۔''[۱۹] چراغ علی بھی سرسید کی اصلاحی تحریک سے متاثر تھے۔اُن کے مضامین بھی ادبی سے زیادہ اخلاقی و اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہیں۔ان کا طرزِ تحریر سادہ اور عام فہم ہے۔

مولوی نذیر احمد کا نام اردو نثر نگاری میں بہت اہمیت کا حامل ہے۔اُن کی اصل وجہ شہرت اُن کی ناول نگاری ہے۔سماج کی اصلاح کرنا اُن کے مضامین کا ہی نہیں ناولوں کا بھی بنیادی مطمع نظر ہے۔ اُن کے مضامین کی تعداد بھی خاصی ہے۔مولوی نذیر احمد کے مضامین کا ایک مجموعہ شوق امرتسری نے ''مولوی نذیر احمد کے مضامین'' کے نام سے مرتب کیا تھا۔ جبکہ بشیر احمد دہلوی نے ''لختِ جگر'' کے عنوان سے اردو کے مختلف صاحبِ طرز ادیبوں کے جو مضامین شائع کیے تھے اُن میں بھی نذیر احمد کے مضامین بھی شامل تھے۔نذیر احمد کے ناولوں کی طرح اُن کے مضامین کا مقصد بھی اصلاحی ہے اُنھوں نے مختلف اخلاقی و سماجی موضوعات کو اپنے مضامین میں برتا ہے۔مولوی نذیر احمد کی نثر قطعیت اور منطقیت سے مزین ہے۔عربی فارسی الفاظ کا استعمال اُن کی تحریروں میں عام ملتا ہے۔ البتہ اُن کا طرزِ تحریر رواں ہے اور کہیں اُس میں جھول محسوس نہیں ہوتا۔بعض انگریزی الفاظ کا استعمال بھی اُنھوں نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔ البتہ نذیر احمد کے مضامین شگفتگی، رعنائی و شادابی سے تہی ہیں اور بقول سیدہ جعفر''اکثر جگہ نذیر احمد کا طرزِ تحریر مضمون نگاری کے لیے زیادہ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔''[۲۰]

الطاف حسین حالی کا تعلق بھی اردو ادب کے عناصر خمسہ سے ہے اور اُن کا اصل میدان سوانح ہے۔مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اُنھوں نے اردو تنقید کی بنیاد رکھی۔''یہ اردو تنقید کی پہلی مبسوط کتاب ہے۔''[۲۱] حالی کے مضامین زیادہ تر علمی نوعیت کے ہیں۔وہ مضامین سے مسرت کشید کرنے کے بجائے قوم کی اصلاح پر توجہ مرکوز رکھتے ہیں اور اُس کی زبوں حالی کو موضوعِ سخن بناتے ہیں۔وہ

بھی سرسید کی اصلاحی تحریک سے متاثر تھے۔ اُن کی نثر میں منطقیت کا دخل زیادہ ہے۔ اُن کے مضامین میں تمثیلی انداز اور خطابیہ لہجہ اختصار کی راہ میں حائل ہے۔ ''حالی کی طرزِ تحریر کی سب سے بڑی خصوصیت اُن کی سادگی اور سلاست ہے۔''[۲۲]

انیسویں صدی میں ہی مضمون نگاری کی صنف کئی اہم تبدیلیوں سے گزر کر اپنی واضح ادبی شناخت قائم کر لیتی ہے اور جلد ہی جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہوجاتی ہے۔ باقاعدہ مضمون نگاری کو رواج دینے میں دہلی کالج نے ہی کلیدی کردار ادا کیا۔ جس نوع کی مضمون نگاری کو رواج دینے میں سرسید نے شعوری کوشش کی اُس کا آغاز ماسٹر رام چندر سے ہی ہوتا ہے۔ سرسید کے رفقاء میں سے بھی اکثر دلی کالج کے تربیت یافتہ تھے اور یہ تمام افراد انگریزی ادبیات سے بہت متاثر تھے اور انگریزی مضمون نگاری کی تقلید میں ہی مضامین لکھ رہے تھے۔ تاہم اردو زبان و ادب میں انہی اصحاب کے ذریعے سے سادہ، رواں اور آسان زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ ان کے مضامین پر مقصدیت کا غلبہ ہونے کی وجہ سے سوائے آزاؔد کے تمام مضمون نگاروں کی زبان میں شگفتگی نمایاں نہیں ہوسکی۔

دلی کالج سے باہر کی فضا میں بھی اس تبدیلی کو محسوس کیا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں سب سے اہم نام ناخدائے سخن مرزا غالب کا ہے۔ غالب کی نثر کے اعلیٰ نمونے اُن کے خطوط کی شکل میں ملتے ہیں جو اُنہوں نے اپنے احباب کو لکھے۔ ڈاکٹر عطش درانی کا تو خیال یہ بھی ہے کہ ''جدید اردو نثر کی داغ بیل مرزا غالب نے ڈالی ہے۔''[۲۳] ماسٹر رام چندر ہوں یا سرسید اِن کے مضامین کی نثر ذات کے لمس سے ناآشنا ہے لیکن غالب نے اپنے نجی خطوط میں مکالمے کا سا انداز اختیار کیا ہے اور روایتی، مصنوعی اور آرائشی نثر سے اجتناب کرتے ہوئے سادہ انداز میں ایک نیا اسلوب وضع کر ڈالا۔ غالب نے اپنے افکارِ پریشان کو کسی مخصوص موضوع کے تابع نہیں کیا اور نہ مرتب ہی رہنے دیا ہے۔ البتہ جدید اردو نثر کو غالبؔ نے بے ساختگی، مکالمہ نگاری، سادگی اور برجستگی عطا کی ہے۔ غالبؔ نے اردو کی غیر تخلیقی نثر کو ادبی اسلوب سے روشناس کرایا۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقاؔر غالبؔ کی زبان و بیان کو سراہتے ہوئے لکھتے ہیں ''جس ادبی اسلوب نگارش کی توقع ایک مضمون نگار سے کی جاسکتی ہے، وہ یقیناً غالبؔ کے ہاں موجود ہے۔ تاہم غالبؔ کے خطوط باقاعدہ مضمون نہیں کہے جاسکتے اور نہ ہی اس نقطۂ نظر سے انہیں لکھا گیا ہے۔''[۲۴]

انگریزی نثر کی سادگی اور قطعیت سے متاثر ہوکر دلی کالج میں اور خصوصاً ۱۸۵۷ء کے بعد اردو نثر میں منشیانہ عبارت آرائی، تشبیہ و استعارہ اور مسجع و مقفیٰ نثر کا استعمال ناپسند کیا جانے لگا۔ فورٹ ولیم کالج کی سادہ نویسی کی تحریک کے علاوہ مرزا غالب کے خطوط کی برجستگی اور سادگی نے بھی اردو نثر کو تکلف، تصنع اور آرائش کے بوجھ سے آزاد کرایا۔ خصوصاً مضمون نگاری کے فروغ میں سب سے نمایاں کام سرسید احمد خاں اور اُن کے رفقاء کا ہے جنھوں نے خیالی موضوعات پر عبارت آرائی کے بجائے عصری مسائل پر سادہ اور منطقی انداز میں مضامین لکھ کر اردو نثر اور اردو ادب کے دامن کو وسعت بخشی۔ ''محبّ ہند'' اور بعد ازاں ''تہذیب الاخلاق'' کے مضامین کی زیادہ تر نوعیت سنجیدہ علمی و اصلاحی مضامین کی تھی۔ گوکہ غالبؔ کے خطوط نے جدید اردو نثر میں شگفتگی کو فروغ دیا مگر باقاعدہ مزاح کا اردو نثر میں آغاز ''اودھ پنچ'' سے خیال کیا جاتا ہے۔

اردو مضمون نگاری میں ''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں کی دین صرف اتنی ہے کہ اُنھوں نے سنجیدہ مضامین کی فضا میں مزاح کی پھلجڑی چلا دی۔ بطورِ مجموعی جائزہ لیا جائے تو اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ ''اودھ پنچ'' کے لکھنے والوں نے اپنے دور کی سیاست اور معاشرت دونوں کو ہی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ سیاسی مسائل پر اُن کے تبصرے اُن کی بے باکی اور صاف گوئی کے مظہر ہیں۔ اودھ پنچ

میں شائع ہونے والے مضامین کے فنی و ادبی مقام کا تعین کرتے ہوئے ڈاکٹر بشیر سیفی نے بڑی متوازن رائے دی ہے:

> جہاں تک اودھ پنچ کی طنز وظرافت کے فنی و ادبی مقام کا تعلق ہے اس کی اساس مبالغہ آمیز جملہ بازی اور ایسی رعایت لفظی پر رکھی گئی ہے جسے اعلیٰ درجے کی ظرافت کہنے میں تامل ہوتا ہے۔ تاہم اودھ پنچ کے قلمکاروں کا یہ کارنامہ اہمیت رکھتا ہے کہ اُنہوں نے طنز ومزاح کو باقاعدہ روایت کی شکل دی اور اس سے اجتماعی مسائل و معاملات میں اصلاح کا کام لیا۔ ۲۵

اودھ پنچ کے اہم لکھنے والوں میں رسالہ کے مدیر منشی سجاد حسین،نواب سید محمد آزاد،مرزا مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برقؔ اور احمد علی شوقؔ شامل ہیں۔

اردو میں مضمون نگاری کا آغاز انیسویں صدی میں دلی کالج کے قیام سے ہوا ۔ اس صنف کو پروان چڑھانے میں ماسٹر رام چندر،سر سید احمد خاں،اُن کے رفقاء اور مولوی محمد حسین آزاد نمایاں ہیں۔جبکہ بیسویں صدی میں لکھنے والوں کی ایسی نسل سامنے آئی جن کے سامنے علمی و ادبی مضامین کا وافر ذخیرہ موجود تھا اور اُنھوں نے اُس سے خوب استفادہ کیا اور اردو مضمون نگاری میں متعدد بہ اضافہ کیا۔بیسویں صدی کے اولیں دور میں لکھنے والوں پر سر سید تحریک کے اثرات نمایاں تھے۔تاہم کچھ لوگوں نے سرسید کی مقصدیت پسندی سے انحراف کا رویہ بھی اپنایا۔اردو مضمون نگاری جس نے انگریزی مضمون نگاری کی تقلید میں اپنے سفر کا آغاز کیا تھا بہت جلد اپنے عصر کی ترجمان بن گئی۔

حوالہ جات

۱۔ شہناز انجم،ڈاکٹر،ادبی نثر کا ارتقاء،پروگیسو بکس،لاہور،۱۹۸۹ء،ص۵۹

۲۔ عطش درانی،ڈاکٹر،اردو اصناف کی مختصر تاریخ،مکتبہ میری لائبریری لاہور،۱۹۸۲ء،ص ۸۸

۳۔ غلام حسین ذوالفقار،ڈاکٹر،مرتب مضامین سرسید،مکتبہ خیابان ادب لاہور طبع اول،۱۹۶۷ء،ص ز

۴۔ سیدہ جعفر،ڈاکٹر،ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں اُن کا حصہ،اورینٹیل ریسرچ انسٹیٹیوٹ حیدرآباد دکن،طبع اول۱۹۶۰ء،ص۲۹

۵۔ سر سید احمد خاں،مضامینِ سرسید منتخبات تہذیب الاخلاق،مرتب غلام حسین، ڈاکٹر،مکتبہ خیابان ادب لاہور،طبع اول ۱۹۶۷ء،ص۱۷

۶۔ سید عبداللہ،ڈاکٹر،سرسید احمد خاں اور اُن کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی وفکری جائزہ، مکتبہ کاروان لاہور،طبع اول۱۹۶۰ء،ص۴۳

۷۔ غلام حسین ذوالفقار،ڈاکٹر،مرتب مضامین سرسید،مکتبہ خیابان ادب لاہور طبع اول،۱۹۶۷ء،ص م

۸۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر،اصنافِ ادب،سنگ میل پبلی کیشنز لاہور،۱۹۷۶ء،ص ۴۸

۹۔ غلام حسین ذوالفقار،ڈاکٹر،مرتب مضامین سرسید،مکتبہ خیابان ادب لاہور طبع اول،۱۹۶۷ء،ص م

۱۰۔ سیدہ جعفر،ڈاکٹر،ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں اُن کا حصہ،اورینٹیل ریسرچ انسٹیٹیوٹ حیدرآباد دکن،طبع اول۱۹۶۰ء،ص ۳۰

۱۱۔ ظہیر الدین مدنی،ڈاکٹر،مرتب :اردو ایسیز،مکتبہ جامع لمیٹڈ دہلی،طبع اول،۱۹۵۸ء،دیباچہ،ص

۱۲۔ افتخار احمد صدیقی،ڈاکٹر،مولوی نذیر احمد احوال و آثار،مجلس ترقی ادب لاہور، اول۱۹۷۱ء،ص۶۳

۱۳۔ غلام حسین ذوالفقار،ڈاکٹر،مرتب مضامین سرسید،مکتبہ خیابان ادب لاہور طبع اول،۱۹۶۷ء،ص ک

۱۴۔ سلیم اختر،ڈاکٹر،انشائیہ کی بنیاد،سنگِ میل پبلیکیشنز لاہور،۱۹۸۶ء،ص۶۴

۱۵۔ غلام حسین ذوالفقار،ڈاکٹر،مرتب مضامین سرسید،مکتبہ خیابان ادب لاہور طبع اول،۱۹۶۷ء،ص ع

۱۶۔ سید عبداللہ،ڈاکٹر،سرسید احمد خاں اور اُن کے نامور رفقا کی اردو نثر کا فنی وفکری جائزہ، مکتبہ کاروان لاہور، طبع اول ۱۹۶۰ء،ص۴۳
۱۷۔ مولوی عبدالحق ،ڈاکٹر ، مرحوم دہلی کالج،انجمن ترقی اردو طبع سوم،س ن،ص۱۴
۱۸۔ سیدہ جعفر،ڈاکٹر،ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں اُن کا حصہ،اورینٹیل ریسرچ انسٹیٹیوٹ حیدرآباد دکن ،طبع اول ۱۹۶۰ء،ص۳۹
۱۹۔ ایضاً،ص ۵۷
۲۰۔ ایضاً،ص ۴۲
۲۱۔ عطش درانی،ڈاکٹر،اردو اصناف کی مختصر تاریخ،مکتبہ میری لائبریری لاہور،۱۹۸۲ء،ص۹۶
۲۲۔ سیدہ جعفر،ڈاکٹر،ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقاء میں اُن کا حصہ،اورینٹیل ریسرچ انسٹیٹیوٹ حیدرآباد دکن ،طبع اول ۱۹۶۰ء،ص۲۷
۲۳۔ عطش درانی،ڈاکٹر،اردو اصناف کی مختصر تاریخ،مکتبہ میری لائبریری لاہور،۱۹۸۶ء،ص۹۲
۲۴۔ غلام حسین ذوالفقار،ڈاکٹر،مرتب: مضامین سرسید،مکتبہ خیابان ادب لاہور طبع اول ،۱۹۶۷ء،ص ن
۲۵۔ بشیر سیفی ،ڈاکٹر،اردو میں انشائیہ نگاری ،نذیر سنز پبلشرز،لاہور،۱۹۸۹ء،ص۱۲۳

ڈاکٹر تبسم کاشمیری
جی سی یونیورسٹی، لاہور

منٹو کی وجودی اخلاقیات

Sa'adat Hassan Manto is an important literary figure in the history of Urdu short story. Diversity in selection of topics and style of narration are most vivid qualities of his work. He was one of those writers who were well aware about nature of western revolutions of that time. This article is an attempt to study Manto's understanding about human beings in context of existentialism and humanism.

نیکوں کو سب گلے لگا لیتے ہیں۔ متقی و پرہیز گاروں کو آگے بڑھ کر ملتے ہیں۔ سر جھکا کر ان کے ہاتھ چومتے، پاؤں کو ہاتھ لگاتے ہیں اور اس عمل سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ مگر بدوں کو گلے کون لگائے گا؟ ان سے محبت کون کرے گا؟ منہ سے شراب کی بُو سونگھ کر کون آگے بڑھے گا؟ ہاں یہ ممکن ہے مگر یہ تو کوئی صوفی ہو سکتا ہے جو اپنے دل دریا میں ان کو جگہ دے۔ اردو فکشن میں ہمارے پاس ایک صوفی منش موجود ہے اور منٹو اردو فکشن کا صوفی منش ہی تو تھا جس کے چاہنے والوں میں کیسے کیسے ذلتوں کے مارے لوگ تھے۔ کیسے کیسے بدنام کردار تھے۔ قحبہ خانوں کی عورتیں، دلال، وغیرہ۔ وہ لوگ کہ جن کو دیکھ کر راویتی نیکی دوڑ لگا جاتی ہے۔ یاد کیجیے موذیل کو، بابو گوپی ناتھ کو، ایشر سنگھ کو، ممی کو اور دیگر کرداروں کو۔ یہ وہ لوگ تھے جو نیکی کی دولت سے محروم نہ ہوئے، جن کے اندر کا انسان جاگ کر اپنی قربانی دینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

منٹو کے افسانوں کی ایک بلند جہت انسان کی تلاش ہے اور منٹو نے اپنے افسانے میں انسان کو دریافت کیا ہے۔ کبھی نہ مرنے والے انسان کو۔ اس نے انسان کو بلند مرتبت لوگوں میں نہیں ڈھونڈا کہ وہاں انسان کی Dehumanization ہو جاتی ہے۔ اور یہ لوگ انسان رہتے ہی کب ہیں۔ ظاہر میں انسان اور باطن میں کچھ اور۔ مگر منٹو کے گنہگار لوگوں میں تو ہم Humanization کا عمل دیکھتے ہیں۔ بدتر اور بدترین لوگوں میں انسان جاگ اٹھتا ہے۔ موذیل جیسی کھلی ڈلی الھڑ لڑکی جو ہر وقت ترلوچن سنگھ اور اس کے انڈرویئر کا مذاق اڑاتی ہے خود ہمیشہ انڈرویئر کے بغیر پھرتی رہتی ہے۔ ترلوچن اسے بار بار انڈرویئر اور حیا کی تلقین کرتا ہے مگر موذیل اسے کہتی ہے۔ "یہ حیا ویا کیا بکواس ہے۔ اگر تمہیں اس کا کچھ خیال ہے تو آنکھیں بند کر لیا کرو۔ مجھ سے ایسی بکواس نہ کیا کرو۔ تم سکھ ہو مجھے معلوم ہے کہ تم پتلون کے نیچے ایک ریشمی سا انڈرویئر پہنتے ہو۔ یہ بھی تمہارے سر کے بالوں کی طرح تمہارے مذہب میں شامل ہے۔ شرم آنی چاہیے تمہیں۔ اتنے بڑے ہو گئے ہو اور ابھی تک یہی سمجھتے ہو کہ تمہارا مذہب انڈرویئر میں چھپا بیٹھا ہے۔"

موذیل جو ترلوچن کے بدن پر صابن کی طرح سے پھر جاتی ہے۔ اس کے ساتھ لیٹی رہتی ہے۔ ایک بار ترلوچن شادی کی درخواست کرتا ہے موذیل شرط لگاتی ہے کہ پہلے اپنے کیس صاف کرا دو۔ دوسرے دن وہ کیس صاف کرا دیتا ہے اور موذیل ترلوچن کو چھوڑ کر ایک دوست کی نئی کار میں ایک تفریحی مقام پر چلی جاتی ہے۔ یہ اس کی ایک جہت تھی واپسی پر جب اسے پتہ چلتا ہے کہ ترلوچن کی منگیتر فسادزدہ بمبئی کے ایک ایسے علاقے میں محصور ہو گئی ہے جو مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ وہ ترلوچن کی منگیتر کو بچانے کے لیے جاتی ہے۔ اسے بچا لیتی ہے مگر خود خطرناک پتھریلی سیڑھیوں سے گر کر مر جاتی ہے۔ منٹو نے خوش باش، شوریدہ سر، آزاد خیال اور مذہب کی قید سے آزاد موذیل

کے اندر ایک خالص انسان کو تلاش کیا تھا۔ ترلوچن اس کے ننگے بدن پر اس وقت اپنا کپڑا ڈال دیتا ہے جب وہ آخری سانسوں پر تھی اس وقت وہ اسے کہتی ہے۔ ''لے جاؤ اس اپنے مذہب کو۔'' اور اس کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتی ہے۔ منٹو انسانوں کا جوہری تھا وہ جانتا تھا کہ کس انسان کے اندر کتنی گہرائی پہ انسان موجود ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ کہانی کی ڈور ڈال کر اسے باہر نکال لیتا تھا۔

موذیل وجودی اخلاقیات کا کردار ہے۔ وہ زندگی کے بھرپور ہنگامے میں شریک ہے۔ تہذیب، معاشرہ، سوسائٹی، تہذیب اور ثقافت کے پھیلاؤ میں وہ مروجہ اخلاقیات کی تابع نہیں ہے بحیثیت فرد وہ اپنی زندگی کے لیے انتخاب کا رستہ اختیار کرتی ہے مذہب کی نفی کرتی ہے اور پوری آزادی کے ساتھ زندہ رہتی ہے۔

یہ بابو گوپی ناتھ انسانوں کا انسان اور عیاشوں کا عیاش۔ لہو ولہب سے مکمل طور پر لتھڑا ہوا۔ تماش بینی میں طوائف کے کوٹھے پر عمر بسر کر دینے والا۔ بے حد گنہگار اور گنہ کا شاہ کار۔ اور بے حد حقیقت پسند بھی۔

بابو گوپی ناتھ کا مسئلہ یہ بنتا ہے کہ اس کی جائیداد اور دولت ختم ہو رہی تھی کچھ مدت سے وہ اپنی خوب صورت محبوبہ زینت کے ساتھ رہ رہا تھا۔ اسے اپنے مستقبل کی فکر نہ تھی وہ زینت کے مستقبل کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ سب کچھ ختم ہو جانے پر وہ کسی رنڈی کے کوٹھے پر یا کسی پیر کے تکیہ میں اپنی باقی ماندہ زندگی گزار دے گا۔ اپنی ذات کے بارے میں تو وہ مطمئن تھا مگر زینت کے لیے اس کے اندر ایک شدید پریشانی نے جنم لے لیا تھا۔ زندگی کی اس منزل میں وہ زینت کا ہاتھ کسی اچھے انسان کو تھما دینا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی کا آخری مسئلہ یہی رہ گیا تھا۔ بالآخر اسے کامیابی ہوتی ہے۔ وہ روایتی طریقے سے اسے رخصت کرتا ہے۔ زینت کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتا ہے اور بڑے خلوص اور بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کہتا ہے ''خدا تمہیں خوش رکھے''۔

منٹو کا فن یہ ہے کہ وہ اس مقام پر بابو گوپی ناتھ کے اندر جھانکتا ہے تو اس کے اندر اسے ایک انسان نظر آتا ہے۔ وہ کبھی بابو گوپی ناتھ کو دیکھتا ہے اور کبھی اس کے اندر کے انسان کو۔ اب منٹو کے لیے اندر کا بابو گوپی ناتھ اہم ہو جاتا ہے اور ظاہر کا گوپی ناتھ بے معنی۔ انسان تو اس کے اندر تھا اسی انسان سے منٹو کی دوستی ہوتی ہے۔ یہ اس کی نئی دریافت تھی۔

منٹو کی ادبی انسانیات میں بابو گوپی ناتھ ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہانی کے آخر میں ہم دیکھتے ہیں کہ بابو گوپی ناتھ کا پرسونا (Persona) پیچھے رہ جاتا ہے۔ اور اس کی جگہ حقیقی اور اصلی گوپی ناتھ ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ منٹو نے اپنے ایک بیان میں آدمی کی ایک تعبیر پیش کی تھی اس نے لکھا تھا کہ ''آدمی یا تو آدمی ہے ورنہ آدمی نہیں ہے۔ گدھا ہے، مکان ہے، میز ہے یا کوئی اور چیز ہے'' میں سمجھتا ہوں بابو گوپی ناتھ میز نہیں، کرسی نہیں، مکان نہیں وہ آدمی ہے۔ یوں دیکھیے تو اس بیان کا بابو گوپی ناتھ پر مکمل طور پر انطباق ہوتا ہے۔ وہ آدمی کی اخلاقیات کی ایک علامت میں ڈھل جاتا ہے۔

منٹو، پریم چند، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی کی طرح افسانہ نگار/کہانی نگار نہیں ہے۔ اردو فکشن نے آغاز سے عہد منٹو تک اور منٹو کے بعد بھی افسانہ/کہانی کی معاشرتی اور جنسی اخلاقیات کے مسلمات کو قبول کیا ہے۔ اس کی پیروی کی ہے۔ اگر اس سے انحراف بھی کیا ہے تو وہ بھی محض سرسری طور پر، معصومانہ سے انداز میں۔ معاشرتی قدغنوں اور منہیات کے خوف سے دبے دبے طریقہ پر۔ منٹو سے پہلے کی کہانی کی جنسی اخلاقیات کا ذرا جائزہ لیجیے اسے بغور دیکھیے کہ کہانی نگار کس طرح سے جنس کا مسئلہ نمودار ہونے پر کنی کترانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے ذکر سے گریز کی طرف بڑھتا ہے اور اس کا مقصود یہ ہوتا ہے کہ اس پر معاشرے کی طرف سے کوئی دھبہ نہ لگ جائے اور اس کی خاندانی شرافت مشکوک نہ ہو جائے۔ جنس کے ذکر سے خوف زدہ ہو جانے والی سوسائٹی، اپنے طور پر جنس کی کس سطح پر زندگی بسر کرتی تھی اس کا ذکر ہی نہ کیا جاتا تھا کہ یہ خوف طاری کر دینے والی بات تھی۔

اور یہ منٹو تھا اردو کا Radical افسانہ نگار جس نے معاشرے کی جنسی اخلاقیات کو ادھیڑ دیا۔ سراسیمگی، خوف، دہشت اور سہم کو اکھاڑ ڈالا۔ افسانے کی سو سالہ تاریخ میں یہ منٹو کی بہت بڑی خدمت تھی مگر اردو افسانے کے روایتی قاری کی سائیکی منٹو کے Radicalism کو برداشت نہ کر سکی اور افسانے کی جنسی اخلاقیات کو یہ سب کچھ ہضم نہ ہو سکا۔

پرانے اردو افسانے کی اخلاقیات کا تعلق تو معاشرتی اخلاقیات سے تھا کہ اردو افسانہ سنجیدگی سے اس روایت کا پیروکار تھا۔ گناہ و ثواب اور خیر و شر کے تصورات اردو افسانے کی روایت کا حصہ تھے، مگر منٹو کلونیل ہندوستان کے ان لوگوں کی اخلاقیات کا افسانہ نگار تھا جو مروجہ اخلاقیات سے ہٹ کر زندگی بسر کر رہے تھے۔

منٹو کی اخلاقیات اردو افسانے کی اخلاقیات نہ تھی۔ منٹو کی اخلاقیات اردو ناول کی اخلاقیات بھی نہ تھی۔ منٹو کی اخلاقیات اس کے کرداروں کے جودی تجربے کی اخلاقیات تھی۔

ترقی پسندوں کی طرح ادب و فن کے بارے میں اس کا کوئی لکھا لکھایا نظریہ نہیں تھا۔ اس کے کرداروں کی حرکت، زندگی میں ان کا عمل، ردعمل، ان کی زندگی کے رویے، معمولات کے سانچے، اور کرداروں کا بہاؤ اس کے وجودی تجربے کو مرتب کرتا تھا۔ اس کے کردار، اس کی کہانی، کہانی کا تانا بانا کسی نظریے کا اظہار نہ کرتا تھا۔ مگر اس کے تخلیقی عمل میں انسان کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔ اور یہی انسان کے وجودی تجربے کا اظہار ہے۔ بین السطور وہ بہت کچھ کہہ جاتا تھا۔

کلونیل دور کے انسانوں کی سماجی کش مکش، ان کی معاشی بدحالی اور اس بدحالی کے اثرات جو ان کی سائیکی پر مرتب ہوئے یہ منٹو ہی سمجھ سکتا تھا۔ مرتب شدہ اخلاقیات سے منہ موڑنا، اسے اہمیت نہ دینا اور اپنے سماجی ڈھانچے کی اخلاقیات میں زندگی بسر کرنا، منٹو کے کرداروں کی خصوصیت ہے۔ یہ لوگ کثافت میں رہتے ہیں اور اسی کو زندگی سمجھتے ہیں۔ مگر ان کے لیے یہ حتمی زندگی نہیں ہے۔ یہ مخصوص وقت کی زندگی ہے جس سے باہر نکل جانے کی خواہش ان کے اندر جھانکتی رہتی ہے۔ خاص طور سے نسائی کرداروں میں۔

وجودی اخلاقیات میں ہم انسانی سائیکی کی دو جہتوں کو دیکھتے ہیں۔ اس کی ایک جہت کا تعلق اس کی خارجی زندگی سے ہے اور دوسری جہت اس کی داخلی دنیا کی ہے۔ وجودی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر خارجی زندگی کی جہت مجروح ہو جائے یا بہت کمزور پڑ جائے تو داخلی جہت اسی کو سہارا دے کر تقویت کا سامان فراہم کرتی ہے۔ جس سے شخصیت تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ منٹو کے کردار بابو گوپی کو دیکھیے اس کی خارجی زندگی اجڑی ہوئی ہے۔ ہم کہانی میں جب اسے دیکھتے ہیں تو اس کی خارجی زندگی بُری طرح تباہ حال ملتی ہے۔ وہ اپنے مستقبل سے مایوس ہے یہاں اس کی داخلی دنیا اس کے لیے نجات کا سامان فراہم کرتی ہے۔ اس کی داخلی دنیا اس کی خارجی دنیا کو Compensate کرتی ہے۔ زینت کی شادی کا منصوبہ اس کی داخلی دنیا کی تخلیق ہے اور یہ منصوبہ اس کی برباد شدہ خارجی زندگی کو بحال کرتا ہے۔

وہ کیا چیز تھی جس نے بابو گوپی چند کے داخلی وجود کو بیدار کیا۔ بابو گوپی چند کہ لہو و لعب کی زندگی کا آدمی تھا اس زندگی کے منفی پہلوؤں کی موجودگی میں اس کی داخلی شخصیت میں خفتہ انسان کیوں کر بیدار ہوا یہ بابو گوپی ناتھ کے وجود کا جوہر تھا جس نے کوٹھے پر زندگی گزارنے والے بابو گوپی ناتھ کے اندر ایک بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ جو وجودی اخلاقیات کی مثال بنتی ہے۔

وجودیت انسان کی ناتمامی کی بات کرتی ہے۔ فلسفیوں کا کہنا یہ ہے کہ یہ ناتمامی اپنے آپ کو مکمل کرنے کی منازل میں رہتی ہے۔ گویا انسان مکمل ہو رہا ہے اور مکمل ہوتا جائے گا۔ یہ بات ایک مخصوص فلسفہ فکر کا اظہار کرتی ہے جس کا اشارہ انسان کی طرف ہے۔ یہ بات Generalize طریقے پر کہی گئی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ انفرادی شکل میں بھی عام انسان اپنے آپ کو مکمل کرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔ یہ وجودی اخلاقیات کا بھی اظہار ہے۔ انفرادی حیثیت میں منٹو کی اخلاقیات یہی کہتی ہے کہ بابو گوپی ناتھ کہ جس کی اخلاقیات ناتمام تھی، ایک

مرحلہ پہ آ کر اس کی اخلاقیات اپنے آپ کو مکمل کرنے کے لیے کوشاں ہو جاتی ہے۔ یہ زینت کی شادی کا مسئلہ ہے۔ جہاں طویل مدت کے جمود اور ٹھہراؤ کے بعد اس کا شخصی جوہر اس کے اندر ایک بڑی تبدیلی لاتا ہے اور وہ اپنی شخصی ناتمامی سے بلند ہو کر شخصیت کو مکمل کرنے میں ارتفاع کے راستہ پر چل پڑتا ہے۔ کچھ یہی صورت حال ہمیں سوگندھی کے کردار میں بھی ملتا ہے۔ سوگندھی جو کسبی ہے۔ سوگندھی جو اپنے نجی کوٹھے پر دھندہ کرتی ہے۔ سوگندھی کہ جو اپنے وجود کے آشوب کی شکار ہے۔ ایک ستم زدہ زندگی کے لیے وہ رنجور ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس کے آشوب نے ہمیشہ کے لیے یوں ہی رہنا ہے۔ ایک شام اس کا دلال اسے ایک سیٹھ سے پسند کروانے کے لیے لے جاتا ہے۔ کار میں بیٹھا سیٹھ سوگندھی کو ایک نظر دیکھتا ہے اور ہونہہ کہہ کر اپنی کار کے ساتھ آگے بڑھ جاتا ہے۔ سوگندھی سوچتی ہے کہ سیٹھ نے اس کی بری طرح تحقیر کی ہے۔ اس مقام پر اس کا وجود بدترین آشوب کا سامنا کرتا ہے۔ اس کا ذہنی انتشار شدت اختیار کر جاتا ہے۔ اس کے اندر انتقام کی آگ بڑھکتی ہے اس کی داخلی اور خارجی شخصیت بری طرح ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔

انسان کے وجودی کرب کی کیفیتوں کو جس طرح سوگندھی کے کردار میں پیش کیا گیا ہے وہ منٹو کا شاہکار کہا جا سکتا ہے۔ اس کی شخصی اکائی ہتک کے بعد مجروح ہو کر بکھرنے لگتی ہے۔ اس کی ذات ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے اور وجود منہدم ہوتا نظر آتا ہے وہ وجودی آشوب کے ہاتھوں برباد ہو جاتی ہے۔ یہ سب کیا ہے یہ سب اس کے جوہر کی بیداری ہے۔ وہ ایک حالت سے دوسری حالت میں منتقل ہونا چاہتی ہے مگر اس کے اندر اور باہر گھمبیر آوازوں کا شور ہے جو اسے بُری طرح جھنجھوڑ رہا ہے۔ ستم یہ ہے کہ ایک حالت سے دوسری حالت میں سفر کرنے کے لیے اس کے پاس انتخاب کا وجودی راستہ تو کھلا ہے مگر وہ وسائل سے محروم ہے۔ اور یہی محرومی اس کے آشوب کو دردناک حد تک بڑھاتی ہے۔

منٹو کی کہانیوں کو وجودی اخلاقیات کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو ان کی معنویت کی تفہیم زیادہ بہتر طور پر ہو سکتی ہے۔ انسان اور انسان کے جوہر کو منٹو نے جس طرح سے دریافت کیا ہے اردو فکشن کے پاس ایسی مثالیں عنقا ہیں یا بے حد محدود ہیں۔ بابو گوپی ناتھ عمر کے آخری دور میں کرائسس کا شکار ہوتا ہے یہ وہ مرحلہ ہے جہاں اسے وجودی انتخاب کے مرحلہ سے گزرنا ہے۔ زندگی کے پرانے ڈھانچہ کو ترک کر کے اسے ایک نیا رستہ اختیار کرنا ہے یہ خیر کا رستہ ہے۔ زینت کے لیے نئی زندگی کا انتخاب خیر کا انتخاب ہے۔ وجودی اخلاقیات سے اس کی کائنات بدل جاتی ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اس نے باقی ماندہ زندگی رنڈی کے کوٹھے پر گزاری یا پیر کے تکیہ پہ بسر کی مگر اس کے جوہر کی اخلاقیات نے زینت کے پامال وجود کو نئی زندگی عطا کر کے مستقبل کے سپرد کر دیا۔

وجودی اخلاق میں فرد اپنی جداگانہ انفرادیت قائم کرتا ہے سوسائٹی کے وضع کردہ اصولوں پر زندگی بسر نہیں کرتا سوسائٹی کے عام اصولوں پر زندگی بسر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ فرد اخلاقی حیثیت سے مردہ ہے گویا اسے زندہ رہنے کے لیے اپنے اصول وضع کرنے ہوں گے۔ اسے خارجی زندگی کا جائزہ لینا ہوگا اور اپنے باطن کی دنیا میں اتر کر زندگی کو سمجھنا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ممی، بابو گوپی ناتھ، موذیل اور سوگندھی وجودی اخلاقیات کے کردار ہیں۔ ان کرداروں کی نئے سرے سے تعبیر ضروری ہے۔ ممتاز شیریں اور وارث علوی کے بعد اکیسویں صدی میں منٹو کے لیے ایک نئے نقاد کی بہت ضرورت ہے۔

حوالے:

۱۔ سعادت حسن منٹو، ''بابو گوپی ناتھ''، مشمولہ ''منٹو نامہ''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۱۹۹۵ء۔

۲۔ سعادت حسن منٹو، ''موذیل''، مشمولہ ''منٹو راما''، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور۔ ۱۹۹۵ء۔

۳۔ سعادت حسن منٹو، ''ہتک''، مشمولہ منٹو نمبر، نقوش لاہور۔

ڈاکٹر قاضی عابد
ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبہ اُردو،
بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان
ڈاکٹر محمد افضال بٹ
شعبہ اردو،
الخیر یونیورسٹی بھمبر (اے، جے، کے)

ادب اور بقائے باہمی ____ تین کہانی کار

کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین

This article reflects some aspects of co-existence in Urdu short story. In its first part it has been discussed what are the theoretical perspectives of co-existence and how literature can reflect it or reflects it. Then the process of co-existence has been shown in three Urdu short story writers Kirishan Chandr, Qurrat ul Ain Hyder and Intazar Hussain who represent different school of thoughts in Urdu literature. One short story of each writer has been analyzed in this context. All the three masters of the genre leave great concern with co-existence in their stories and leave much impact on the readers.

ایلون ٹوفلر نے اپنی بے حد معروف کتاب (Third Wave) موجِ سوم/تیسری لہر(۱) میں انسانی سماج کی معلومہ تاریخ کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ زرعی یا جاگیردارانہ سماج، صنعتی یا سرمایہ دارانہ سماج اور مابعد صنعتی یا مابعد سرمایہ دارانہ سماج۔ اگرچہ ان کا خیال ہے کہ زرعی سماج سے پہلے بھی قبائلی یا اوائل قبائلی خانہ بدوش قسم کے گروہ موجود تھے لیکن وہ سماج کی تعین شدہ تعریف پر پورا نہیں اترتے۔ انسانی تہذیب اور ثقافت کا آغاز زرعی سماج سے ہوا اور یہیں سے انسانی زندگی میں جنگ و جدل، لڑائی جھگڑا، استحصال، قتل و غارت، ہوسِ زر اور خواہشِ ملک گیری کا آغاز ہوا۔ گویا معاشرے کی تعمیر سازی میں مثبت اقدار کی آمیزش کے ساتھ ساتھ معاشرے کی شکست و ریخت کے عوامل بھی شروع ہو گئے۔ انسانی لوبھ، لالچ اور زر پرستی بھی معاشرے کی ابتدا کے ساتھ ہی انسانی زندگی میں در آئی۔ یہیں سے انسانی زندگی میں طاقت کا چلن ہوا اور جس کی لاٹھی اُس کی بھینس کا ''بین الاقوامی آفاقی'' محاورہ وجود میں آیا۔ لیکن یہ تو کبھی نہیں ہوا کہ انسانی معاشرہ، ملک یا ریاستوں کا کوئی مجموعہ محض شر یا خیر محض کے سہارے ہی آگے بڑھا ہو، انسانی معاشرے ان دونوں کی آویزش سے اپنا وجود برقرار رکھتے ہیں، مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب خیر اور شر کے تناسب میں عدم توازن پیدا ہوتا ہے۔ جنگ اور جدل استحصال کے ایسے ہتھیار ہیں جو زندگی میں مختلف سطحوں پر اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ یہ دائرے کبھی بڑے اور کبھی چھوٹے ہوتے ہیں جن کے اندر انسان اپنی لالچ، لوبھ، خواہش حکمرانی، استحصال اور لوٹ مار کے ذریعے عدم مطابقت پیدا کرتے ہیں۔ جنگیں ہوتی ہیں قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوتا ہے، ایک دوسرے کے ملک پر چڑھائی کی جاتی ہے اور کمزور مغلوب ہو کر شکست سے دوچار ہوتا ہے۔ اسی جنگ و جدل نے ماضی بعید سے لے کر ماضی قریب تک نو آبادیات کے سلسلے کو بھی جنم دیا۔ انسانی تاریخ کی پہلی معلومہ نو آبادی روم تھی جس کے آقا یونانی تھے۔ بعد کو یہ نو آبادی خود عظیم سلطنتِ روم کا روپ

دھار گئی۔ ماضی قریب میں دوسری جنگِ عظیم کے کچھ بعد تک پورا ایشیا اور افریقہ یورپ اور جاپان کی نو آبادی بنا رہا اور آج ہم سب امریکی سامراج کی دکھائی نہ دینے والی لیکن پوری شدت کے ساتھ محسوس ہونے والی غلامی کے دائرے میں ہیں ، دنیا میں سب سے زیادہ عدم مطابقت اور آویزش نو آبادیاتی نظام نے پیدا کی ۔ اگر ہم نو آبادیاتی طاقتوں سے تعلق رکھنے والے لکھاریوں کے لکھے گئے بیانیوں میں موجود اعداد و شمار کو دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ دنیا میں بے حد و حساب انسانی جانوں کا ضیاع ، معاشی استحصال ، جنگ و جدل ،قتل و غارت اور دولت کی لوٹ مار پچھلے دو سو برس میں ہوئی۔ ہندوستان ، چین ، افریقہ، ایران وغیرہ جیسے نو آبادیاتی خطوں میں انسانی استحصال کی جو تاریخ رقم ہوئی وہ پوری انسانی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہے۔ سفید آدمی نے کالی دنیا کا ہر طرح سے استحصال کیا۔ یوں انسانی تاریخ میں عدم مساوات کو ایک مستقل قدر کی حیثیت حاصل ہوگئی پھر بیسویں صدی میں یورپ نے ایک دوسرے کے ساتھ دو بڑی جنگیں لڑیں۔ ان جنگوں میں بھی نو آبادیاتی ممالک نے بھر پور زخم کھائے ، خام مال سے لے کر پختہ انسانوں تک ان جنگوں میں جھونک دیئے گئے ۔ دنیا رہنے کی جگہ کی بجائے ایک ذبیحہ خانہ (سلاٹر ہاؤس) میں تبدیل ہو گئی۔ انسان ہی انسان کا اس قدر دشمن ہو گیا کہ محض اپنے اتحادیوں کو اپنی قیادت کا مطیع و فرمانبردار بنانے کی غرض سے ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے گئے۔ انسانی استحصال کی یہ کہانی صنعتی سماج میں خوب پھلی پھولی۔ طلب، رسد، منڈی، کارپوریشن اور اس سے ملتے جلتے اداروں نے انسانی اقدار کی حیثیت اختیار کر لی اور انسانی آدرشوں کی جگہ لے لی۔ جنگ ، اسلحہ، دولت، انسانی شعار محسوس ہونے لگے۔ جمعیتِ اقوام سے لے کر اقوامِ متحدہ تک سبھی ادارے سامراج کے گماشتے نظر آنے لگے، ایسے میں اگر کوئی روشنی کی امید تھی تو وہ صرف ادیب اور دانشور تھے جنھوں نے اپنے قلم سے انسانی معاشروں میں ہم آہنگی، محبت، خلوص اور پیار ایسے جذبات کی ضرورت پر زور دیا اور لوگوں کو بقائے باہمی کے نئے نئے طریقوں سے روشناس کرانے کے عمل کو اپنے شعر و ادب کا موضوع بنایا۔ ہر زمانے کے لکھاری اور ادیب نے محبت کے ساتھ رہنے کا درس دیا اور اپنے تخلیقی عمل کو خیرِ مسلسل کا اعلامیہ بنانے کی سعی کی۔ ایذرا پاؤنڈ سے لے کر پابلو نرودا تک اور انتونیو گرامچی سے لے کر نوم چومسکی تک اور دنیا بھر کے تخلیقی دانشورانہ ضمیر نے ہر طرح کی عدم رواداری ،جنگ، مذہبی تشدد پسندی اور پیکار میں الجھے انسانوں کو مختلف اوضاع کی جمالیات/ادبی وضع کاری/دانش وارانہ تحریروں کے ذریعے بدلنے/بہتر بنانے کی کوشش کی۔ یہ دنیا بھر کی دانش اور تخلیقی ضمیر ہی تھا جس نے انسانیت کو بقائے باہمی/co-existence کا راستہ دکھایا۔ تنوع انسانی معاشرے کا حسن ہے اگر اس تنوع کو باعثِ آزار اختلاف/مخالفت میں ڈھال لیا جائے تو دنیا کا یہی حسن اس کی بدصورتی بن جاتی ہے۔ تخلیقی فن کار اس حسن اور بدصورتی کی ثنویت کے اندر موجود رمزوں کو کھولتا اور اس دنیا کو ہمارے لیے گوارا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

☆☆☆

اپنی شعریات/جمالیات/ادبی وضع کاری میں آخر تخلیقی فنکار کے پاس وہ کون سا اسمِ اعظم یا ہنر مندی ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ اس بظاہر ناممکن کام کو ممکن بناتا ہے۔ ادیب واعظ ، پادری ، ملّا یا سیاسی رہنما نہیں ہوتا اگرچہ اس کے پاس ان تمام زمروں کے عاملین کی نسبت سننے اور پڑھنے والوں کی ایک محدود دنیا ہوتی ہے لیکن اس کے فنی رموز اور اظہار کے اسالیب کی جادوگری زیادہ گہری ہوتی ہے۔ ادیب واعظ یا خطیب کی طرح بے اثر بھاشن نہیں دیتا بلکہ وہ اپنے فن کی جادوگری اور پیغمبری کے ذریعے غیر محسوس طریقے سے لوگوں کو ان کے اپنے ایسے تجربات سے روشناس کراتا ہے یا متعارف کراتا ہے کہ انہیں وہ دنیا اپنی لگتی ہے۔ تخلیق

کار افلاطون کی دنیا کا نقال نہیں ہوتا بلکہ وہ ارسطو کی دنیا کا خلاق شخص ہوتا ہے جو اپنے تخلیقی عمل کی دنیا میں مختلف موضوعات ، ذرائع اور طریقوں کا استعمال کر کے ایک متوازی دنیا تعمیر کرتا ہے جو ہمیں اپنی ہی دنیا محسوس ہوتی ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے موضوع کے حوالے سے تخلیق کاروں کی یہ وضع کردہ دنیا ہمیں کیا بتاتی ہے۔ یہ تو طے شدہ امر ہے کہ ایک مثالی دنیا کا تصور اور خواب فنکار کی آنکھ میں ازل سے بسا ہوتا ہے لیکن وہ اپنے تخلیقی عمل کی وضع کاری میں کسی یوٹوپیا کی تعمیر اور وسائل کے ذریعے سے کرتا ہے اس کی تخلیقی دنیا کے متوازی ایک مثالی دنیا جہاں بس حسن، خیر اور جمال ہوتا ہے جو پہلے اس کی آنکھوں اور دل میں بسیرا کرتے ہیں اور تخلیق کے وجود میں آنے کے بعد وہ مثالی دنیا قاری/نقاد کے ذہن اور دل میں منتقل ہو جاتی ہے۔ کسی فن پارے کے پڑھت/قرآت میں قاری یا نقاد بیک وقت انہی دو دنیاؤں سے نبرد آزما ہوتا رہتا ہے۔ بڑا ادیب اپنے تخلیقی عمل میں یوٹوپیائی نہیں ہوتا وہ اپنے تخلیقی عمل کے باہر یوٹوپیائی ہوتا ہے۔ اس کی تخلیقی دنیا اسی کھردری ، تکلیف دہ، دکھ سے معمور، عدم مساوات ، عدم رواداری اور عدم مطابقت والی ہماری آپ کی دنیا کی طرح ہوتی ہے۔ اس کے متن کے متوازی جو دنیا ہمارے ذہنی عمل کا حصہ بنتی ہے وہ اسی تعمیر شدہ دنیا کی ثنویت یا Binary opposition ہوتی ہے۔ گویا بین المتونیت کی اس شکل میں ایک تو وہ دنیا ہوتی ہے جس میں ہم آپ موجود ہیں ، ایک دنیا خلاق ذہن اپنی وضع کردہ شعریات کی مدد سے تعمیر کرتا ہے اور تیسری دنیا وہ مثالی دنیا ہوتی ہے جو بیک وقت لکھنے والے پڑھنے والے کے اپنے ذہن ، خوابوں ، تصورات ، آدرشوں اور مثالیوں میں گندھی ہوتی ہے گویا یہ تین طرح کی دنیائیں بین المتونیت کے اس عمل میں یک جان ہو کر معنی اور مفہوم کی تشکیل کرتی ہیں۔ کرشن چندر، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین نے اپنی تخلیقی کارگزاری میں بقائے باہمی کی نعرہ سازی یا نعرہ بازی نہیں کی بلکہ اپنے تخلیقی عمل کے ذریعے اس عدم مساوات ، عدم روادار، ظالم کا ساتھ دینے والی دنیا کا ایک مرقع ہمارے سامنے بنا کر قاری کے ذہن میں بقائے باہمی کی اہمیت اور افادیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ بقائے باہمی کی اصطلاح میں جو وسعت پنہاں ہے اس سے ہم آپ بخوبی واقف ہیں لیکن اختصار کے ساتھ یہ بات صرف اتنی ہے کہ دنیا کا حسن مل جل کر رہنے میں ہے ۔ اس کی کئی پرتیں سیاسی ہیں، کئی تہذیبی ہیں، کئی جغرافیائی ہیں اور کئی تاریخی بھی، یہاں پر ان تخلیق کاروں کی ایک ایک کہانی کو منتخب کر کے اس کی اس طرح پڑھت/قرأت کی جائے گی کہ مختلف اور متنوع صورتحال میں بقائے باہمی کے سیاق وسباق میں ان متون کے اندر پوشیدہ معانی کو دریافت کیا جا سکے۔

☆☆☆

کرشن چندر کی کہانی 'نئے غلام' کوریا کی جنگ کے تناظر میں لکھی گئی کہانی ہے ۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی میں جنم لینے والی جدیدیت کی تحریک سے منسلک ناقدین شاید اسے ادنی متن کا درجہ بھی نہ دے سکیں لیکن اُردو کے مابعد جدید ناقدین (۲) اس کہانی کی قرأت میں اس کے متن کی کثیر الجہتی یا مفاہیم کے تنوع کو ضرور سراہیں گے۔ یہ کہانی سرد جنگ کے اولین دور کی کہانی ہے۔ ویت نام ، عراق، افغانستان میں ہونے والی جنگوں سے ذرا پہلے امریکی سامراج اور دنیا پر کارپوریٹ کلچر کے غلبے کا دیباچہ اسی جنگ کے ذریعے لکھا گیا۔ یہ کہانی بقائے باہمی کے تناظر میں اس طرح پڑھی جاتی ممکن ہے کہ پرانے نو آبادیاتی نظام کے ملبے پر جو نیا ریموٹ کنٹرول نو آبادیاتی/سامراجی نظام وجود میں آرہا تھا یہ اس کی کئی جہتیں اور رمزیں منکشف کرتی ہے۔ نیو مارکسسٹ نقاد آلتھیو سے کا خیال ہے کہ متن کے اندر بعض اوقات جو آواز سنائی دے رہی ہوتی ہے وہ معنی کشائی نہیں کرتی بلکہ جو کچھ وقفوں اور خاموشی کے بیچ میں ہوتا ہے وہ اپنے قاری سے زیادہ بلیغ انداز میں یا گہرائی کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے ۔ کرشن چندر کی اس کہانی میں

بھی جو کچھ اونچے سروں میں ہے وہ محض آرکسٹرا ہے گانے کے بول خاموشیوں میں مستور ہیں یا پھر دریدا کے لفظوں میں جو کچھ مرکز میں ہے اسے لامرکز کر کے جو کچھ حاشیے میں ہے اس کے ذریعے کچھ سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

خط کی تکنیک میں لکھی گئی اس کہانی میں قلم کار اپنے نام کے ساتھ موجود ہے، عین ممکن ہے کہ مصنف کی موت کے دعوے دار نقادوں کو یہ بدعت بری لگے مگر اس طرح تو شاید وہ کرشن چندر تو کجا منٹو کی تحریروں کو بھی اپنے تنقیدی عمل کا حصہ نہیں بنا پائیں گے۔ بیانیات (Narratology) کی شعریات وضع کرنے والے ناقدین اگرچہ اس نام کی موجودگی کو راوی کہہ کر اس کی بہتر توضیح کرنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ یہاں بھی کوشش کی جائے گی کہ اس کہانی کی پرتوں کو بیانیات (Narratology) کی تنقیدی بوطیقا کے ذریعے پڑھا جائے۔

الف) کہانی کا تناظر کوریا کی جنگ ہے۔

ب) کہانی کا موضوع یک رُخا نہیں بلکہ یہ متن کثیر المعنی رکثیر الجہت ہے۔ یہ امریکہ کے باقی دنیا پر غلبے کی کتھا بھی ہوسکتی ہے۔ یہ نو آبادیاتی چیرہ دستیوں اور نو آبادیاتی ذہن، اوضاع اور کارکردگی کی کہانی بھی ہوسکتی ہے یہ اس مقتول سپاہی کینتھ شیڈرک کی کہانی بھی ہوسکتی ہے جو یہ بھی نہیں جانتا کہ وہ کیوں مارا گیا یا وہ کیوں لڑ رہا تھا۔ یہ بقائے باہمی کی ضرورت کو اجاگر کرنے والی کہانی بھی ہوسکتی ہے کہ دنیا سے جنگ، بھوک، مفلسی اور سرمایہ دارانہ تسلط اور نیا نو آبادیاتی دباؤ ختم کر کے اسے امن، رواداری، بھائی چارے اور خیر کی اقدار کے ساتھ زندہ رہنے کے قابل بنایا جائے۔

یہ اور اس طرح کی معنویت کی کچھ اور لہروں کا اس متن کے اندر ارتکاز دیکھا جا سکتا ہے لیکن کوئی بھی تنقیدی پڑھت اپنی ضروریات کے مطابق ہی اس متن کو کھولنے کی کوشش کرے گی۔ اس کہانی کو بقائے باہمی کے تناظر میں پڑھنے کے لیے ہمیں امریکی سامراج کے کردار کو زیرِ بحث لانا ہوگا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ دو بڑی جنگوں کے بعد جب اقوامِ یورپ نے اپنی اپنی حماقتوں کے اعتراف کے بعد بقائے باہمی کی ضرورت کو محسوس کر لیا جس کا سب سے بڑا مظاہرہ تو آگے جا کر یورپی یونین کے قیام کے طور پر سامنے آیا لیکن باقی دنیا (اور کچھ کچھ یورپ بھی) امریکی غلبے کی خواہش کی مطیع کیوں بنتی گئی۔

پھر یہ کہانی اس نظریے کی ردِ تشکیل رتعمیر نو کے کام بھی آ سکتی ہے کہ امریکہ نے کوریا سے لے کر ویت نام، عراق سے افغانستان تک جو کم و بیش پچاس سے زیادہ ممالک سے جنگیں لڑیں یا ان ممالک پر محدود حملے کیے۔ کیا وہ صرف سرمایہ اور مارکس کی جنگ تھی، امریکہ دنیا کو کمیونزم سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا یا پھر وہ اپنے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا، یہ متن اس سارے تاریخی عمل کی ایک مختصر ردِ تشکیل کر سکتا ہے اور ہم فوکو کو یاد کر سکتے ہیں کہ کسی بھی کلامیہ یا ڈسکورس کو طاقت کی منشا کے مطابق بُنا جاتا ہے۔ دانشور یا ادیب طاقت کی منشا کے مطابق بُنے گئے کلامیے کی مختلف جہتوں کو کھولتا ہے۔ اب اس کہانی کے کچھ اقتباسات دیکھئے اور انہیں بقائے باہمی کے اس وسیع تناظر میں کھولنے کی کوشش کریں:

> ''سپاہی شیڈرک تم ابھی کوریا کے کسی اونچے ٹیلے پر مرے پڑے ہو، اور میں تمہارے دل کے اندر گھسی ہوئی کارتوس کی گولی دیکھ سکتا ہوں۔ تمہاری آنکھوں کا کرب تمہارے سنہرے بال دھوپ میں چمکتے ہوئے دیکھ کر میرا دل غم اور غصے سے بھر جاتا ہے، اور میں پوچھتا ہوں کہ وہ کون تھا جو تمہیں یہاں لایا۔ جس نے تمہاری جوانی، تمہاری محبوبہ،

تمہاری ماں کی محبت چھین لی اور تمہیں وطن سے اتنی دُور اجنبی ٹیلے پر مرنے کے لیے مجبور کیا۔ وہ کون تھا جس نے تمہارے ہاتھ میں بندوق دے دی اور تم سے کہا جاؤ اپنی ۲۰ سالہ جوانی کی ساری آرزوؤں اور اُمنگوں کو اجنبی کوریا کے میدانوں اور پہاڑوں پر لے جاکے ان کے سینے میں گولی داغ دو؟.....وہ کون تھا؟.....وہ کون سی طاقتیں تھیں؟.....ہمیں ان کا پتا چلانا ہے کیونکہ امن کی پیاسی دنیا اس سوال کا جواب چاہتی ہے۔''(۳)

''لیکن ایک دوسرا امریکہ بھی ہے۔عوام کا امریکہ نہیں، عوام کا حق غصب کرکے ان پر حکومت کرنے والوں اور فوجی راہنماؤں اور بڑے بڑے تاجروں کا ''امریکہ''۔ امریکہ جو فورڈ کا ہے، ڈلر کا ہے، ڈوہان کا ہے، راک فیلر کا ہے، اور مورگان کا ہے اور دوسرے سینکڑوں ایسے تاجروں اور بینکروں کا ہے جن کا نام بھی میں نہیں جانتا۔لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہی وہ امریکہ ہے جس نے تمہیں کوریا میں موت کے گھاٹ سلایا ہے اور جن کا ہاتھ مجھ پر پڑ جائے تو مجھے بھی موت کے گھاٹ اتار دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔یہ عظیم تجار سونے، چاندی، لوہا، کوئلہ، تیل، زہریلی دواؤں اور اسلحہ جات کی سامراجی کوٹھیوں کے مالک یہ وہ ہیں جو ہر جاندار یا غیر جاندار شے کو شخصی منافع کے لیے بیچتے ہیں۔ جنھوں نے تمہیں بھی ایک تھوڑے سے منافع کے لیے کوریا میں بیچ دیا ہے۔ شاید تمہارے ہاتھ بندوق دیتے وقت انھوں نے تمہیں راز بتایا ہوگا ،تم سے صرف یہ کہا ہوگا کہ تم امریکی قوم کے حقوق کی حفاظت کرنے کوریا جا رہے ہو۔تمہیں اس وقت ان راہنماؤں سے پوچھنا ہوگا کہ وہ کون سے امریکی حقوق ہیں اور وہ کوریا میں کیا کر رہے ہیں کیونکہ ان حقوق کو واپس امریکہ میں مغربی ورجینیا میں نہیں بلا یا جاتا جہاں وطنیت کے ایک صحیح اور جامع جذبے سے سرشار ہو کے ان کی حفاظت کرسکتا ہوں؟''(۴)

''کوریا پر کوریا والوں کا حق ہے، جس طرح امریکہ والوں کا حق ہے وہ جس طرح چاہیں اس کی قسمت بنائیں بگاڑ دیں۔جس طرح کی حکومت چاہیں بنائیں، اپنے راہنما چنیں اپنا معاشی اور سیاسی نظام بدلیں اور انھیں اس بات کا پورا پورا اختیار ہے کہ ان کی اندرونی اور خارجہ پالیسی کیا ہوگی ۔ ان کے جھنڈے کا رنگ کیا ہوگا اور ان تمام باتوں پر ان کا حق فائق ہے، اور کسی اجنبی کو یہ حق نہیں ہے کہ ان کے متعلق اپنا فیصلہ ان پر ٹھونس دے، اگر کوریا کے لوگ آپس میں مل بیٹھ کر صلح صفائی سے اس معاملے کو طے کر لیتے ہیں تو بہت اچھا ہے ،لیکن اگر وہ اس معاملہ کو اپنی ذاتی نجی خانہ جنگی سے طے کرتے ہیں تو بھی کسی دوسرے کو اس میں بولنے کا حق ہے.....وہ صلاح دے سکتا ہے۔اس خانہ جنگی کو اچھا یا بُرا کہہ سکتا ہے ،لیکن بندوق اُٹھا کے ان کے گھر میں نہیں گھس سکتا۔''(۵)

ان اقتباسات کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ جنگ لوگ نہیں کرتے ، یہ سامراجی مقاصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہوتی ہے اور بس۔ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ امن اور بقائے باہمی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں ، ترقی اور خوشحالی کے خواہاں ہیں مگر یہ سامراجی نظام ہے جو ان لوگوں پر ان کی مرضی کے برعکس جنگ مسلط کر دیتا ہے تاکہ وہ اپنی مرضی کی دنیا بنا سکے جہاں زیادہ سے زیادہ نفع کما کر ایک خاص طبقے کا اور اس کے مفادات کا تحفظ کیا جا سکے۔ ڈیوڈ کورٹن نے اپنی کتاب ''کارپوریشنوں کی حکمرانی''(۶) میں ایلون ٹوفلر نے ''تیسری لہر،موجِ سوم''(۷) میں سرمایہ دارانہ نظام کے ارتقا کا جو جائزہ لیا ہے وہ ہمیں ان حوالوں سے خاصی جانکاری عطا کرتا

ہے۔

قرۃ العین حیدر نے بھی اپنے افسانوی ادب میں جن موضوعات پر زیادہ زور دیا ہے اس میں کسی معاشرے کے اندر موجود ایک فرد کی زندگی پر کچھ سیاسی اور سماجی محرکات کے اثرات کا مطالعہ زیادہ اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرۃ العین حیدر کا رشتہ جدیدیت کی تحریک سے جوڑا گیا ، یہاں پر یہ صراحت ضروری ہے کہ قرۃ العین حیدر کا تعلق 'شب خونی جدیدیت'(۹) کی بجائے مغرب میں روشن خیالی ، مارکسزم ، ہیومنزم اور وجودی فکر کے تناظر میں ابھرنے والی جدیدیت کے اثرات سے زیادہ ہے۔ اسی سبب سے وہ مغرب میں ہونے والی خوں ریزی اور اس کے اسباب سے بھی پوری طرح واقف ہیں اور اس امر سے بھی آگاہ ہیں کہ مغرب نے کس طرح سے مشرق کا استحصال کیا لیکن وہ اس سارے عمل کو محض بیسویں صدی کی خاص بات رعطا نہیں سمجھتیں بلکہ وہ پوری انسانی تاریخ میں حاکم اور محکوم کے کھیل کو درست تناظر میں اپنے تخلیقی وژن رعمل کا حصہ بنانے پر قادر ہیں۔اگرچہ 'شیشے کے گھر'، 'ستاروں سے آگے' اور 'پت جھڑ کی آواز' سے لے کر اپنی آخری بڑی تخلیقی گواہی 'قید خانے میں تلاطم ہے کہ ہند آتی ہے' تک اپنے تشکیل کردہ متون میں وہ جس صورت حال کو ابھارتی ہیں وہ اپنے کوڈز اور کنونشنز کے ذریعے اپنے قاری کو بقائے باہمی کا پیغام دینے کا فریضہ سرانجام دیتی ہیں۔ یہ دنیا خوبصورت تھی، فطرت کی کوکھ سے جنم لینے والے حسن کو جنگوں ، انسانی استحصال، غلامی، طبقاتی تضاد اور سرد جنگ نے چاٹ کھایا۔

یہاں پر ان کی ایک کہانی 'روشنی کی رفتار' کا تجزیہ کیا جا رہا ہے جس میں انھوں نے کم وبیش تمام انسانی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر اس انسانی تماشے کو دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح سے انسان کن کن وسیلوں سے اپنے جیسے انسانوں کا استحصال کرتے ہیں کہ انھیں لا انسان متصور کر لیتے ہیں۔ اس کہانی کو سائنس فکشن کے زمرے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے لیکن کہانی کو بننے والے گہری فنی رموز رتکنیک رہیئت راسلوب سب مل کر اسے ایک بڑا فن پارہ بنا دیتے ہیں ۔ یہاں کہانی کے کچھ ساختیوں کو نمبر وار ظاہر کیا جا رہا ہے:

الف) کہانی وقت کے ایک خاص متعین لمحے میں آغاز ہوتی ہے اور اپنا سفر مستقبل کی طرف رزمانی ترتیب کی بجائے ماضی کی طرف کرتی ہے۔علت اور معلول کے عمومی رشتے کو توڑ کر ایک اور طرح کا معلول اور علت کا رشتہ جنم دیتی ہے۔ ڈاکٹر پدما میری ابراہام کرین خلائی علوم(Space Science) کی ماہر ہے۔ یہاں غور طلب بات اس کردار کا نام ہے جو مابعد نو آبادیاتی رردِ نو آبادیاتی علوم میں پیوند کاری (Hybridity) کی مثال ہے کہ اس کا ایک جزو مقامی اور ایک غیر مقامی ہے۔ اس کا تعلق ایک ایسے خطے سے ہے جو خود اس خطے کی طرح قدیم ہے جس کے ماضی میں اسے انسانوں پر انسانوں کا جبر دکھانا مقصود ہے۔ ڈاکٹر پدما ایک ٹائم مشین میں بیٹھ کر زمین اور زمان دونوں کی حدود و قیود کو توڑ کر اپنے زمانے سے تین ہزار ایک سو اکاسی برس پیچھے کی طرف لوٹ جاتی ہے۔

ب) یہ قدیم مصر کا وہ دور ہے جہاں فراعین کا راج تھا۔

(i) مصر کی اپنے وقت کی یا آفاقی اور ہر وقت اعلیٰ ترین سمجھی جانے والی تہذیب اپنے اعلیٰ ترین مظاہر کے ساتھ موجود ہے۔

(ii) اہرام اور دیگر عظیم الشان عمارتیں تعمیر ہو چکی ہیں یا ہو رہی ہیں۔

(iii) دنیا کے قدیم ترین متون تشکیل دیئے جا چکے ہیں اور ان کو محفوظ کرنے کا انتظام ہو چکا ہے۔صحیفہ ممتوفین، اقوال تاہ ہوتپ، اور مختلف رومانی داستانیں اور کہانیاں وجود میں آچکی ہیں ، ہر طرف عظمت کے آثار زندہ صورت میں موجود ہیں جنھیں بعد کے زمانے میں برٹش میوزیم یا کچھ اور آثار گاہوں کا سرمایہ بننا ہے۔

(iv) لیکن اس کے ساتھ ساتھ قدیم مصر کی تمام تر قباحتیں بھی موجود ہیں ۔ بنی اسرائیل انہی مظاہر کی تعمیر کے لیے غلام بن چکے ہیں یہ وہ پہلی معلومہ تاریخ ہے جس سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مذہب، تہذیب اور عظمت کے نام پر کس طرح غلامی جیسا قبیح ترین ادارہ وجود میں آیا۔ یہ نو آبادیات کی اپنی ایک وضع تھی۔ بنی اسرائیل ظلم وستم کا شکار تھے۔ میخائیل بن حنان اسی گروہ کا نمائندہ کردار تھا جبکہ ثوث اس نو آبادکار قوت کا نمائندہ ہے۔

(v) یہ وہ چمکدار اور عظیم تہذیب ہے جس کے تضادات نہ صرف اپنے خطے میں رہنے والے دیگر مذاہب یا نسلوں سے تعلق رکھنے والے افراد سے ہیں بلکہ باہر کی ہم عصر حکمرانی اور اشوریہ تہذیبوں سے بھی ہے۔ وہ تہذیب بھی انسانیت کو بہت کچھ عطا کرنے والی تھیں لیکن ان کے اندر بھی ایک زعم عظمت تھا جس سے اس زمانے میں دنیا کی مختلف تہذیبوں کے بیچ ایک ایسا تضاد پیدا ہوا جس نے ان کے بیچ جنگوں کو جنم دیا۔ استحصال کو پیدا کیا اور انسانی خون اور زندگی کو مقابلے کی اس آگ میں ارزاں کر دیا۔

(vi) اس کہانی میں پدکا کرین ، ثوث، میخائل بن حنان تین مختلف ادوار ، تہذیبوں اور زمینوں کے لوگ ہیں مگر ان سب کا مقدر اور تقدیر ایک ہے ، ان کرداروں کے اپنے اپنے زمانے کے اندر آنے والے ابتلا انہیں محض ایک ہی بات/نقطے پر ایک کرتے ہیں اور وہ جنگ وجدل ، نا انصافی ، سماجی اونچ نیچ، غلامی ، استحصال اور ظلم وستم کے مقابل بقائے باہمی کا حوالہ ہے۔ بقائے باہمی کی خواہش بنیادی طور پر انصاف ، جمہوریت ، یگانگی اور برداشت کے کلچر کی خواہش ہے۔

یہ قدیم و جدید متحارب تہذیبیں اگر بقائے باہمی کی ضرورت کو محسوس کرلیں تو ان کے اندر کے تمام تر تضادات ختم ہو سکتے ہیں کہانی کے اندر ایک سیاسی رو بھی موجود ہے اور وہ دو جگہوں پر نشان زد کی جا سکتی ہے، ایک تو خود قدیم مصر کے اندر جہاں فراعین اور ان کے پیروکاروں کا بنی اسرائیل کے ساتھ سیاسی تضاد ہے اور دوسرا مصر کا ایک تہذیب کے طور پر کلدانیوں اور اشوریوں کے ساتھ۔ یہ قومی اور ملی یا بین ا لاقوامی تضاد موجودہ قومی اور ملی یا بین الاقوامی سیاسی صورت حال سے بے حد مشابہ ہے۔ یہ کہانی جدیدیت کے ساتھ ہم رشتہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک مابعد جدید اختصاص بھی اپنے اندر رکھتی ہے۔ ارتقا کے عمومی نظریئے کا راور روشن خالی کے مرکزی یا کبیر بیانیہ ہونے کا درس کہانی کی فکر کو جبکہ قدیم متون کا حوالہ ، قدیم متون کی مکرر تخلیق اور کہیں کہیں پیروڈی کا شائبہ اسے مابعد جدید دائرے میں لے آتا ہے۔ Hyper Reality، تشکیل کردہ حقیقت اور اس کا ابطال بھی کئی جگہوں پر اس کہانی کو مابعد جدید صورتحال کے قریب کر دیتے ہیں۔ ذیل کے اقتباسات اوپر بیان کردہ نکات کو استناد عطا کر سکتے ہیں :

''ہم دنیا کی قدیم ترین تہذیب ہیں''۔ ثوث نے ٹہلتے ٹہلتے بڑے جوش سے کہنا شروع کیا۔ ''یہ کلدانیہ اور اشوریہ والے بھی اپنے متعلق یہی دعویٰ کرتے ہیں اور ہم سے لڑنے آتے ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ ہمارا ان کا کیا مقابلہ۔ ہم ان سے ہر لحاظ سے برتر ہیں۔''

پدما زیرِلب مسکرائی۔ ''مگر ایک بات ضرور ہے''۔ ثوث نے دالان کے کتب خانے میں واپس آتے ہوئے کہا۔ ''کلدانی اور اشوری بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ یہ الواح دیکھو، اور ساتھ ہی اس قدر سفاک''۔ اس نے سفالی الواح کے انبار کی طرف اشارہ کیا۔ ''جنگ سے پہلے ان کی یہ کتابیں سینکڑوں اونٹوں پر لاد کر ہمارے یہاں لائی جاتی تھیں۔'' اس نے جھک کر باریک خط میخی میں کندہ ایک لوح اُٹھائی۔(۱۰)

''انسانوں میں خوف و دہشت نہ پھیلاؤ خدا اس کی سزا دے گا۔ جو شخص کہتا ہے ساری طاقت اور سارا اقتدار میرا ہے اکثر وہی ٹھوکر کھا کر گر بھی پڑتا ہے۔ ہمیشہ بیت ترحم میں سکونت رکھو۔ دینے والا خدا ہے۔ بندہ یہ نہ سمجھے کہ وہ خود کچھ حاصل کر سکتا ہے۔ اور خبردار ـــــ الفاظ کے ذریعے کبھی فساد نہ پھیلانا ـــــ''(۱۱)

''بہت خوب''۔ ثوث نے کہا۔ وہ گھر واپس پہنچے۔ غلام کھانے کی میز پر ان کے منتظر تھے ـــــ ڈنر کے دوران میں پدما نے اپنے میزبان سے پوچھا ''ثوث ـــــ تم نے مجھے عبرانیوں کی جاسوس کیوں سمجھا تھا؟ کیا یہ لوگ تمہارے لیے ایک مسئلہ ہیں''؟

''ہاں'' ثوث نے مچھلی سے کانٹا نکالتے ہوئے جواب دیا۔ مشعلوں کی روشنی اس کے شکیل چہرے پر جھلملا رہی تھی ''مگر ہمارے فرمانرواؤں نے اس مسئلے کا بڑا انسانیت کش حل تلاش کیا ہے۔ سارے عبرانی مردوں سے جان لیوا بیگار لی جاتی ہے۔

''یہ اہرام جو تم دیکھتی ہو ان میں سے کئی انھوں نے بنائے ہیں۔ بے چارے لاکھوں من پتھر میلوں دُور سے ڈھو کر لاتے ہیں اور خون تھوک کر مر جاتے ہیں ـــــ بے چارہ میخائیل ـــــ اسے دریائی چنگی پر منشی گیری مل گئی تھی اس کا خیال تھا بچ نکلے گا مگر اس کا نام بھی فہرست میں آ گیا ہے ـــــ''

''تم کچھ نہیں کر سکتے؟''

''اکیلا میں ـــــ ایک پورے نظام کے خلاف کیا کر سکتا ہوں ـــــ؟'' اس نے افسردگی سے پوچھا۔(۱۲)

''یہی سمجھ لو اور سنتے جاؤ۔ یہاں سے نکل کر تم بنی اسرائیل کنعان میں سلطنت قائم کرو گے۔ پھر اشوریہ کے بادشاہ تم کو قید کر کے بابل لے جائیں گے۔ تم تورات کے صحائف لکھو گے۔ ایران کا شاہ سائرس تمہیں آزاد کر کے فلسطین بھیج دے گا۔ تمہارے ہاں داؤد بادشاہ کی نسل میں یسوع پیدا ہوگا'' پدما نے غیرارادی طور پر صلیب کا نشان بنایا۔

متحیر عبرانی اسے تکتے رہے۔ اس نے کہا۔''رومن تمہیں جلا وطن کریں گے۔تم ساری دنیا میں مارے مارے پھرو گے۔ پھر۔آج کی رات سے پورے سوا تین ہزار سال اور ولادت مسیح سے انیس سو اڑتالیس برس بعد تم اسی کنعان میں نئی حکومت قائم کرو گے۔ اور جس طرح تم کو دوسری قوموں نے جلا وطن کیا تھا۔تم عربوں کو ان کے وطن سے نکال دو گے۔''(۱۳)

''اپنے وقت میں ___؟'' پدما نے حیرت سے دہرایا۔''یہ زمانہ چھوڑ کر___؟'' ''یہ زمانہ___!؟ اس میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں___؟''اس نے تلخی سے کہا اور پھر ٹیلی ویژن کھولا۔ نیوز ریل میں دنیا بھر میں بپا جنگوں اور نسلی اور مذہبی فسادوں کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔

''بتاؤ مجھ سے سوا تین ہزار سال بعد کتنی متمدن ہو___؟ہم بنی اسرائیل پر ظلم ڈھاتے تھے اور اشوریہ سے لڑتے تھے۔تم سب ایک دوسرے کے ساتھ بے انتہا پیار محبت سے رہتے ہو۔ ہمارے فراعنہ ستم پیشہ تھے۔تمہارے حکمران فرشتے ہیں۔ہم موت سے ڈرتے تھے تم موت کے خوف سے آزاد ہو چکے ہو۔تم عالی شان مقبرے نہیں بناتے،مردہ پرستی نہیں کرتے،نوحے نہیں لکھتے۔شعروشاعری بھی ترک کر چکے ہو۔''

''تمہارے مذاہب، فلسفے، اخلاقیات ،نفسیات___''وہسکی کا گلاس میز پر پٹخ کر زور سے ہنسا۔''تمہاری دیو مالائیں،نظریہ تثلیث ، روحانیت، یہ، وہ ، سب عین سائنٹفک ہیں۔تمہاری جنگیں ہیومنزم پر مبنی ہیں۔تمہارا نیوکلیر بم بھی خالص انسان دوستی ہے___ہے نا___؟ تمہاری روشنی کی رفتار واقعی تیز ہے___؟

''تم تھوڑی دیر کے لیے خود کو out of time محسوس کر رہے ہو اور کوئی بات نہیں۔ چلو پکچرز ہو آئیں۔''(۱۴)

ان متنوع اقتباسات میں جہاں ایک طرف ایسے قدیم متون کو نقل کیا گیا ہے جو انسانوں کو مساوات ، برابری اور امن ومحبت کے ساتھ رہنے کا درس دیتے ہیں تو دوسری طرح ان متون کو مقدس سمجھ کر ان کے ماننے والوں کا ان متون سے اعراض بھی موجود ہے۔ اسی طرح جدیددور کے فلسفیوں کو ماننے والوں اور ان کے عمل کے بیچ تضاد بھی دکھایا گیا ہے، یوں ارتقا، روشن خیالی اور مذہبی متون کے آفاقی ہونے کے تصورات پر بھی بیک وقت طنز کیا گیا ہے۔

انتظار حسین کی افسانوی دنیا میں بھی ایسی تخلیقات کی فراوانی دکھائی دیتی ہے جو ہمیں زندگی میں بقائے باہمی کی ضرورت پر ایمان لے آنے کی راہ سمجھاتی ہیں۔موضوع کی مناسبت سے ان کی افسانوی اور غیر افسانوی تحریروں میں بے پناہ تنوع دکھائی دیتا ہے۔'قیوما کی دکان' سے لے کر' شہرزاد کے نام' تک کی کہانیوں اور'چاند گہن' سے لے کر' آگے سمندر ہے' تک کے افسانوی متون میں عدم رواداری ، جنگ و جدل، نا انصافی اور مقامی اور عالمی استحصال کی صورت حال کو ابھار کر اساطیری دور سے لے کر آج کے زمانے تک انھوں نے بقائے باہمی کی ضرورت کو ہر جگہ نمایاں طور پر ابھارا ہے، انھوں نے کچھ افسانوی تکنیکوں سے مدد لے کر جس

صورتحال کو خلق کیا ہے اسی کے اندر سے انسانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنے کی اہمیت محسوس ہوتی ہے۔ ان کی کہانی 'مورنامہ' کا تجزیہ کثیر معنی کی تخلیقی واردات کے متنوع جہات ہمارے سامنے لا سکتا ہے۔

'مورنامہ نسبتاً قریب کے زمانے میں خلق کیا گیا متن ہے جسے انتظار حسین کا نمائندہ متن بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔اس میں بقائے باہمی کی جتنی متنوع شکلیں ہمیں نظر آتی ہیں وہ ان کے کسی اور جدید یا قدیم متن میں نظر نہیں آتیں۔ یہاں پر اس کہانی کی تفہیم و توضیح کے مختلف زاویوں کو مدِ نظر رکھا جا رہا ہے:

الف) بنیادی طور پر یہ کہانی ایٹم بم کی تباہیوں کی قدیم اور جدید روایتوں ، اندیشوں اور وسوسوں کے ارد گرد گھومتی ہے اور دنیا کی تباہی کے خوفناک مناظر کو ہمارے تخیل کا حصہ بناتی ہے۔ انسان جب انسان کا خون بہانے کے نئے نئے اور جدید طریقے دریافت کرتا ہے تو اس کا مجموعی اثر اس کائنات پر کیا پڑتا ہے۔ انسانیت اور فطرت دونوں ایک دوسرے سے مربوط چیزیں ہیں۔ انسان کا فطرت کو تسخیر کرنے کا دعویٰ بہت بودا نظر آتا ہے۔ یہ تسخیر کم ہے اور فطرت کی تباہی زیادہ ہے مگر انسان جس چیز کو سمجھ نہیں پاتا وہ یہ بات ہے کہ وہ بھی فطرت کا ایک اٹوٹ حصہ ہے اور اگر فطرت کے اندر اس کی حرکتوں کی وجہ سے تبدیلیاں رُونما ہوں گی تو عین ممکن ہے کہ وہ خود اس کے لیے کچھ بہتر ثابت نہ ہوں۔ یہی صورتحال ایٹمی جنگ اور اس کے تباہ کن اثرات کے حوالے سے بھی کہی جا سکتی ہے۔

ب) مغرب میں جنم لینے والے نئے تنقیدی رویوں میں سے ایک ماحولیاتی تنقید(Eco-Criticism)یا سبز تنقید (Green Criticism) بھی ہے جس میں پہلی بار انسان دوست ماحول کی بجائے ماحول دوست انسان کی بات کی گئی ہے۔ یہ کہانی اس تناظر میں بھی پڑھی جا سکتی ہے۔ چاغی کے پہاڑ اور راجستھان کے صحرا پر ان تجربوں کے کیا اثرات مرتب ہوئے ۔ کہانی میں راجستھان کے موروں اور پہاڑ پر موجود فطری زندگی پر ہونے والے ظلم کی تفصیلات بہت واضح ہیں۔ موروں کی اساطیری اہمیت کے پیشِ نظر بیانیہ کے اندر تفاصیل اس ضمن میں ہیں مگر یہ ایک اشارہ ہے اس آفت کی طرف جو انسان اس کے عواقب کو سمجھے بغیر اپنے اوپر لے آیا ہے۔ پوری جنگلی حیات اور صحرا کی زیست اس چیز سے متاثر ہوئی ہیں۔ماحول صرف انسانوں کے لیے نہیں ہوتا یا انسانوں پر محیط نہیں ہوتا بلکہ اس ماحول کو انسانوں کے لیے گوارا بنانے کے لیے چرند پرند اور دیگر عناصر بے حد اہم ہوتے ہیں۔تسخیر فطرت کا انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کا نعرہ اب فرسودہ ہو چکا ہے یا اس کے مفہوم میں تبدیلی کی ضرورت ہے ۔ کہا جا سکتا ہے کہ فطرت میں رُونما ہونے والی تبدیلیوں کو خواہ سماوی ہوں یا انسانی پہلے پہل چرند پرند ہی محسوس کرتے ہیں۔ راجستھان میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی سب سے پہلے موروں نے محسوس کیا جبکہ انسان ہر طرف اپنی تباہی کا جشن منا رہے تھے اور ایک پاگل پن پر محیط جوش عجیب و غریب قسم کے نعروں میں ڈھل رہا تھا۔ فطرت کے اندر انسان کے ہاتھوں رُونما ہونے والی تبدیلیاں بالآخر انسان ہی کی تباہی کا سبب بنتی ہیں۔ اس لیے ماحولیاتی تنقید فطرت کی دوست

ہوتی ہے اور ادب کے ذریعے فطرت دوستی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ فطرت دوستی ہی بنیادی طور پر انسان دوستی ہے۔ یہ بھی فطرت اور انسان کی بقائے باہمی کی ایک شکل ہے۔ انسان کے پڑوسی محض انسان ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ ماحول بھی اس کا پڑوسی ہوتا ہے جس میں وہ زندہ ہوتا ہے اگر وہ ماحول بگڑ جائے تو بقائے باہمی کی مساوات بھی بگڑ جائے گی۔

ج) یہ متن ہندوستان اور پاکستان کی آزادی کے فوراً بعد جنم لینے والے فسادات کے ایک غیر مختتم جنگی جنون میں ڈھل کر اپنی تباہی کا سامان پیدا کیے رہنے اور بالآخر ایٹم بم بنا لینے تک اور ایک دوسرے کی بربادی کا پورا سامان کر لینے کی روایت کو اپنے اندر ملفوظ کیے ہوئے ہے۔ پاکستان اور ہندوستان کی تقسیم کی وجہ بننے والا حق خود ارادیت رفتہ رفتہ ایک ایسے قومی بیانیے میں کیوں ڈھل گیا کہ اس کی بنیاد پر ایک اَن گھٹ دشمنی نے جنم لیا اور دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کو ایٹمی دوڑ کا مسابقت بردار بنا دیا۔ یہ کبیر بیانیہ جس کی بنت میں سرحد کے دونوں اطراف کی خاکی و غیر خاکی نوکر شاہی اور نسبتاً کم عقل اور غیر سنجیدہ سیاست دانوں کے ساتھ اوسط ذہانت رکھنے والے سرکاری درباری دانشوروں کی کاوشیں شامل تھیں، ایک مستقل دشمنی اور خطِ جنگ میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ 'مورنامہ' اور اس طرح کے دیگر متون اس کبیر بیانیہ کی شکست کا مابعد جدید سبب بن سکتے ہیں۔

د) اس کہانی میں اساطیری حوالہ بہت اہم ہے، پہلا حوالہ تو شراوستی اور مہاتما بدھ کا موروں سے تعلق کے ذریعے بنا گیا ہے۔ جہاں مور امن، حسن اور خوبصورتی کی علامت ہے۔ وہاں مہاتما بدھ امن شانتی اور بقائے باہمی کی علامت ہے۔ جبکہ دوسرا حوالہ اور ارجن، درونا کے بیٹے اشوتھاما اور برہم استر (ایٹم بم) کا ہے۔ دیوتاؤں نے کوشش کر کے بالآخر اشوتھاما کا چلایا ہوا برہم استر راستے میں پکڑ لیا تھا لیکن کیا جدید دور میں ایسے جدید دیوتا پیدا ہوں گے یا پھر اس کتاب میں شامل ایک غیر افسانوی تحریر کے مطابق یہ بندر کے ہاتھ میں استرا ہوگا، کیا آج کے کوروکشیتر کے میدان میں کوئی اس طرح کی قسم کھانے والا ہے کہ دونوں فریق آج کے برہم استر (ایٹم بم) کو نہیں چلائیں گے۔ کہانی کے درج ذیل اقتباسات بہت بامعنی ہیں:

> ''اور جب میں نے اس سفر کو یاد کیا تو میری ساری فضائے یاد موروں سے بھر گئی۔ اور میں حیران ہوا کہ اچھا وہاں اتنے موروں سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ جیسے راجستھان کے سارے مور میرے اردگرد اکٹھے ہو گئے ہوں مگر اب وہاں کیا نقشہ ہوگا۔ میں دھیان ہی دھیان میں پھر اس دیار کی طرف نکل جاتا ہوں۔ میں حیران و پریشان بھٹکتا پھر رہا ہوں نہ کوئی مور دکھائی پڑ رہا ہے نہ ان کی جھنکار سنائی پڑ رہی ہے۔ وہ سب کہاں چلے گئے۔ کس کھوہ میں جا چھپے۔ دور ایک ٹیلے پر نظر گئی۔ ایک نچا کھسٹا مور بیٹھا دکھائی دیا۔ میں تیز قدم اٹھاتا اس طرف چلا۔ مگر میرے پہنچنے سے پہلے اس نے ایک ہراس آمیز آواز نکالی، اڑا اور فوراً ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔'' (۱۵)

''عراق امریکہ جنگ کی ساری ہولناکی اس آن میرے لیے اس مرغابی میں مجسم ہوگئی تھی۔ مجھے دکھ ہوا کہ یہ مرغابی اس وقت کتنی اذیت میں ہے اور حیرانی ہوئی کہ آدمیوں نے اس ہنگام جو کچھ ایک دوسرے کے ساتھ کیا، صدام حسین نے عراقیوں کے ساتھ، عراقیوں نے کویتیوں کے ساتھ، امریکہ نے عراقیوں کے ساتھ اس سارے عذاب کو اس غریب مرغابی نے اپنی جان پر لے لیا ہے۔ عجب بات ہے جب پیغمبری وقت پڑتا ہے تو بڑے بڑے جان بچا کر نکل جاتے ہیں۔ کوئی سی جان اذیت کے اس بارگراں کو اکیلی سنگھوا لیتی ہے۔ اس گھڑی وہ مرغابی مجھے ایک جلیل القدر داستانی پرندہ نظر آئی۔ جیسے اس میں کسی پیغمبر کی روح سما گئی ہو کہ اس زور پر اس نے انسانی امت کا سارا عذاب ایک امانت جان کر اپنے کاندھوں پر لے لیا ہے۔''(۱۶)

''جنگ آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے۔ اشوتھاما کو دیکھو اور عبرت پکڑو۔ درونا چاریہ کا بیٹا، باپ نے وہ عزت پائی کہ سارے سورما کیا کورو کیا پانڈہ، اسکے سامنے ماتھ ٹیکتے تھے، چرن چھوتے تھے۔ بیٹے نے باپ سے ورثے میں کتنا کچھ پایا، مگر یہ ورثہ اسے پچا نہیں۔ اس جنگ کا سب سے ملعون آدمی آخر میں یہی شخص ٹھہرا۔''(۱۷)

''درونا نے مرنے سے پہلے اپنے بیٹے اشوتھاما کو برہم استر کا گر سمجھا دیا تھا مگر سختی سے تاکید کی تھی کہ کسی حال میں اسے استعمال کرنا نہیں ہے مگر جب درونا جنگ میں مارا گیا تو اشوتھاما کو روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں تھا۔ جنگ کے آخری لمحوں سے ڈرنا چاہیے۔ جنگ کے سب سے نازک اور خوفناک لمحے وہی ہوتے ہیں۔ جیتنے والے کو جنگ نبٹانے کی جلدی ہوتی ہے۔ ہارنے والا جی جان سے بیزار ہوتا ہے تو وہ خوفناک ہتھیار جو بس ڈرانے دھمکانے کے لیے ہوتے ہیں، آخری لمحوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ پھر بیشک شہر جل کر ہیروشیما بن جائے دل کی حسرت تو نکل جاتی ہے۔ جنگ کے آخری لمحوں میں دل کی حسرت کبھی جیتنے والا نکالتا ہے، کبھی ہارنے والا۔ کوروکشیتر میں آخر میں دل کی حسرت اشوتھاما نے نکالی اور برہم استر پھینک مارا۔''(۱۸)

''تب ارجن نے اپنا برہم استر نکالا اور اشوتھاما کے توڑ پر اسے سر کیا۔ وار کہتے ہیں کہ جب ارجن کا بان چلا تو ایسی بڑی آگ بھڑکی کہ تینوں لوک اس کے شعلوں کی لپیٹ میں آگئے۔ اس کی دھمک اس بن تک بھی پہنچی جہاں ویاس رشی بیٹھے تپ کر رہے تھے۔ انھوں نے تپسیا بیچ میں چھوڑ دی۔ ہڑ بڑا کر اُٹھے اور اڑ کر کوروکشیتر پہنچے۔ اشوتھاما اور ارجن کے بیچ آن کھڑے ہوئے اور دونوں ہاتھ اٹھا کر چلائے کہ ڈھٹو یہ تم نے کیا انیائے کیا۔ ساری سرشٹی جل کر بھوبھل بن جائے گی۔ جیو جنتو کا وناش ہو جائے۔ اپنے اپنے استر واپس لو۔''(۱۹)

''ہے مہاراج' کوروکشیتر میں میرے سب ہی بڑے موجود تھے، ادھر بھی اور ادھر بھی اور دونوں ہی طرف گنی گیانی بدھیمان موجود تھے۔ پھر انھیں یہ سمجھ کیوں نہ آئی کہ یدھ مہنگا سودا ہے۔ سب کچھ اجڑ جائے گا' وناش ہو جائے گا۔''

ویاس جی نے لمبا ٹھنڈا سانس بھرا' بولے''پتر' یدھ میں اچھے اچھے مانو کی مت ماری جاتی ہے۔ اور ہونی کو کون ٹال

سکتا ہے۔''

اور رشی جی ترنت اٹھ کھڑے ہوئے۔ جن بنوں سے آئے تھے الٹے پاؤں انھیں بنوں میں چلے گئے۔''(۲۰)

ان تینوں فکشن نگاروں کی یہ(مفروضہ) نمائندہ کہانیاں اس دنیا کو جنت بنانے کی خاطر اس دنیا کے باسیوں کو بقائے باہمی کا ہی سبق سکھاتی ہیں۔

حوالہ جات/حواشی

۱۔ تیسری لہر/موجِ سوم ایلون ٹوفلر کی کتاب Third Wave کے دو اُردو تراجم ہیں جو بالترتیب مشعل بکس لاہور اور مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد سے شائع ہوئے۔ اول الذکر کے مترجم تنویر اقبال ہیں اور یہ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی جبکہ موخر الذکر کے مترجم توحید احمد ہیں جبکہ اس کی نظر ثانی ڈاکٹر محمود الرحمٰن نے کی اور یہ ۱۹۹۹ء میں شائع ہوئی۔

[Toffler, Alvin, Third Wave, London, Pan books, 1990.]

۲۔ اُردو کے مابعد جدید ناقدین کی ذہنی نشوونما جدیدیت کے جس ماڈل میں ہوئی وہ شمس الرحمٰن فاروقی اور وزیر آغا کا متعارف کرایا ہوا ہے۔ یہ دونوں ناقدین اپنی اپنی اُفتادِ طبع کی وجہ سے جدیدیت کے نام پر یا تو نئی اینگلو امریکن تنقید کے اوضاع استعمال کرتے رہے ہیں یا نارتھ روپ فرائی سے متاثر ہو کر تنقید کی ثقافتی جہات پر زیادہ زور دے رہے ہیں۔ یہ دونوں اصحاب جدیدیت کی مغربی روایت یا روپ سے کوئی تعلق نہیں رکھتے بلکہ ادب کے غیر سیاسی کردار کے موید ہیں اس لیے یہ اور ان کے بے شمار مقلدین ایسے ادب کے استحسان کی فطری صلاحیت سے بہت دور ہیں جو اپنی بنت میں سیاسی سروکار رکھتا ہو یا مزاحمت کا تاثر پیدا کرتا ہو۔ اس لیے ہمارے اکثر مابعد جدید ناقد ادب اور سیاست پر یا تو بات ہی نہیں کرتے یا پھر فاروقی اور آغا صاحب کی متعارف کردہ جدیدیت کی تعبیر و توضیح کو مابعد جدیدیت کے نام سے موسوم کرتے چلے جاتے ہیں یوں وہ مابعد جدیدیت کا نام استعمال کر کے فاروقی کی صاحبزادی کے لفظوں میں 'دیسی واد جدیدیت' کے تنقیدی اوضاح زیر مطالعہ متون پر آزماتے چلے جاتے ہیں۔

۳۔ کرشن چندر، نئے غلام، مشمولہ: کرشن چندر کے سو افسانے (ترتیب: آصف نواز چوہدری)، لاہور، چوہدری اکیڈمی، بار سوم، ۲۰۰۹ء، ص ۱۱۰۳

۴۔ ایضاً، ص ۱۱۰۵

۵۔ ایضاً، ص ۸۔۱۱۰۷

۶۔ ڈیوڈ کورٹن، دنیا پر کارپوریشنوں کی حکمرانی، شرکت گاہ، کراچی، ۲۰۰۴ء

۷۔ ٹافلر، ایلون، حوالہ سابقہ

۸۔ کرشن چندر، قرۃ العین حیدراور انتظار حسین تینوں اہل قلم الگ الگ مزاج کے حامل ہیں۔ ان کی فکر اور تخلیقی عمل کی جہات اور وابستگیاں بھی یکساں نہیں، لیکن بقائے باہمی کے حوالے سے ان کی تخلیقی اور تحلیلی فکر ایک جیسے نتائج کو ہمارے سامنے لاتی ہیں۔ ترقی پسندوں سے بغض رکھنے والے ناقدین کرشن چندر کو بڑا تخلیقی فنکار تسلیم نہیں کرتے۔ اسی طرح کچھ ترقی پسند ناقدین بھی قرۃ العین حیدر کی اُفتادِ طبع اور انتظار حسین کی ترقی پسند لکھاریوں سے معاصرانہ چھیڑ چھاڑ کے تناظر میں ان کے تخلیقی عمل کو سراہنے (appericiation) سے قاصر رہتے ہیں لیکن مستقبل کا ادبی ناقد ان تینوں بڑے فکشن نگاروں کے ساتھ جب انصاف سے کام لے گا تو ان تینوں کی تخلیقی دنیا کے کچھ ایسے گوشے ضرور سامنے آئیں گے جو اپنے معاشرے کی تخلیقی نمائندگی کرتے ہوئے ایک جیسے ہوں گے۔ یہ مضمون بھی شاید اسی ہی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

۹۔ 'شب خونی جدیدیت' کے نمائندہ نقاد شمس الرحمٰن فاروقی قرۃ العین حیدر کو اہم فکشن نگار تسلیم نہیں کرتے اسی طرح پاکستان میں مظفر علی سید بھی قرۃ العین حیدر کو بڑا فکشن نگار تسلیم نہ کر کے اپنے تنقیدی عمل کو بے اعتبار کرتے ہیں۔

۱۰۔ قرۃ العین حیدر، روشنی کی رفتار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۹۲ء، ص ۱۹۵

۱۱۔ ایضاً، ص ۱۹۶

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۰۵

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۱۰

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۱۵

۱۵۔ انتظار حسین، مورنامہ، مشمولہ: شہرزاد کے نام، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۸، ۲۹

۱۶۔ ایضاً، ص ۲۸

۱۷۔ ایضاً، ص ۳۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۳۳، ۳۴

۱۹۔ ایضاً، ص ۳۴

۲۰۔ ایضاً، ص ۳۶

ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد
اسسٹنٹ پروفیسر
شعبہ اُردو، علامہ اقبال یونیورسٹی، اسلام آباد

''ایک پہاڑ اور گلہری'' کا غیر مطبوعہ منظوم پنجابی ترجمہ از صوفی تبسّم

Allama Muhammad Iqbal(1877-1938) started poetry in an early age. He translated into urdu some poems of the English poets as William cooper, Longfellow,Tennyson and Emersonin the begining of his poetry. These poems written for children were full of action and dynamism.The poem " The Mountain & The Squrril" is also included in these poems.This Poem was written by the American Poet Emerson. Iqbal represented its central idea in the form of a long poem, but at the time of publication of " The Bang e Dra" only selected couplets of this poem were included. Sufi Ghulam Mustafa Tabassum translated these slected couplets into Punjabi in 1974.

This poetic translation of Sufi Sahib is beeing published for the first time by this article.

[۱]

علامہ محمد اقبال[۱۸۷۷ء تا ۱۹۳۸ء]بیسویں صدی کے بے بدل شاعر اور بے مثل مفکر تھے۔ انھوں نے صحیح معنوں میں شعر وادب کے دھارے کا رُخ بدل کر اُسے نئے موضوعات، اسالیب اور لفظیات سے آشنا کیا۔ان کے نزدیک شاعری محض حظ بخشی اور لذت یابی کا ذریعہ نہیں ۔وہ شاعر کی تکنیکی ہنر مندی اور فنی مشاقی کو اُس وقت تک بے معنی سمجھتے ہیں جب تک اس کی شاعری اعلا مقصدیت کی حامل نہ ہو۔ اقبال نے طالب علمی کے زمانے میں شعر گوئی کے میدان میں قدم رکھا۔اُن کی ابتدائی شعر گوئی روایتی طرز کی حامل تھی۔مولوی میر حسن کی صحبت نشینی، داغ دہلوی کے حلقۂ تلامذہ میں شمولیت اور مشاعروں کی عمومی فضا نے انھیں مشرقی آدابِ شعر گوئی سے مکمل طور پر واقف و آگاہ کر دیا تھا تاہم ان کی روح کی بے قراری اور مزاج کی سیمابیت'' کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے'' کی طالب تھی۔اسی ابتدائی زمانۂ شعر گوئی میں وہ مغربی ادبیات کے مطالعے کی طرف متوجّہ ہوئے۔ ابتدائی انگریزی نصابات میں شامل انگریز شعرا کی ولولہ انگیز اور مقصدیت کی حامل نظموں نے اقبال کو بہ طورِ خاص متاثر کیا۔ان چھوٹی چھوٹی نظموں میں حرکت وعمل کا پیغام جس عمدگی کے ساتھ پیش کیا گیا تھا، اُسے اقبال نے پسند کیا ۔مشرقی ادبیات میں اگرچہ موضوعاتی نظمیں لکھی جارہی تھیں تاہم ان میں وہ پیغام موجود نہیں تھا جو جدید مغربی شاعری میں روح کی طرح موج زن تھا۔اقبال نے مشرقی ادبیات کے منظر نامے کو اس نئے طرزِ احساس سے روشناس کرنے کے لیے مغربی طرز کی نظموں کو اُردو میں رواج دیا۔ اوّل اوّل انھوں نے انگریز شعرا کی ان نظموں کو جو پرائمری درجے کے نصابوں میں شامل تھیں،اُردو میں ڈھالنے کی کوشش کی۔بعض نظموں کا کھلا ترجمہ پیش کیا اور بعض نظموں کے مرکزی خیال سے استفادہ کرتے ہوئے طبع زاد نظمیں تخلیق کیں۔بانگِ درا کے حصّہ

اوّل کی کئی منظومات جیسے: ایک مکڑا اور مکھی، ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، بچے کی دُعا، ہمدردی، ماں کا خواب، پیامِ صبح، عشق اور موت اور رخصت اے بزمِ جہاں اسی خوشہ چینی اور استفادے کا اظہاریہ ہیں۔ انگریزی شعرا سے استفادے کا یہ سلسلہ ۱۹۰۵ء تک پھیلا ہوا ہے۔ اقبال نے جن شعرا کی نظموں کا اُردو میں ترجمہ پیش کیا یا اُن کے مرکزی خیال پر اپنی نظموں کی بنیاد رکھی، ان میں ولیم کوپر، لانگ فیلو، ایمرسن اور ٹینی سن کے نام نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ اقبال نے ان شعرا سے استفادے کا واضح اعتراف کرتے ہوئے اپنی نظموں کو ''ماخوذ'' قرار دیا۔ اگرچہ اقبال نے بعض نظموں کو اپنے جذب وشوق سے ایسے انداز میں پیش کیا کہ وہ کسی طرح بھی مذکورہ شعرا کی منظومات سے مستفاد معلوم نہیں ہوتیں۔ اُردو میں اقبال کی ان نظموں کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کیوں کہ ابتدائی نصابات میں ایسی منظومات کا شمول وقت کی ضرورت تھی۔ ان نظموں کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ بانگِ درا کی ترتیب وتشکیل کے وقت اقبال نے ان نظموں کے منتخب اجزا کو مجموعے میں شامل رکھا، جب کہ ابتدائی دور کی کئی نظمیں اور غزلیں بانگِ درا میں شامل ہونے سے محروم رہیں۔ یہ نظمیں اقبال کے شعری مزاج کو سمجھنے کا ایک ذریعہ ہیں اور ان کی روشنی میں اقبال کی فکر کے تشکیلی مراحل کو جاننے میں مدد ملتی ہے۔

[۲]

نظم ''ایک پہاڑ اور گلہری'' معروف امریکی شاعر رالف رالڈو ایمرسن [۱۸۰۳ء تا ۱۸۸۲ء] کی نظم The Mountain & The Squirrel کا کھلا ترجمہ ہے۔ اقبال نے ایمرسن کی نظم کا لفظ بہ لفظ یا سطر بہ سطر ترجمہ پیش نہیں کیا بل کہ اُس کے مرکزی خیال کو وسعت دے کر نظم کی صورت دی۔ ایمرسن کی نظم ذیل میں پیش کی جاتی ہے تاکہ اقبال کے استفادے اور اضافے کا اندازہ لگایا جا سکے:

The Mountain & The Squirrel

The Mountain & The Squirrel
Had a quarrel,
And the former called the latter " Little
Prig."
Bun replied,
" You are doubtless very big;
But all sorts of things and weather
Must be taken in togather,
To make up a year
And a sphere.
And I think it no disgrace
To occupy my place.
If I am not so large as you,
You are not so small as I,
And not half so spry,
I 'll not deny you make
A very pretty squirrel track;
Talents differ; all is well and wisely put;
If I can not carry forests on my back,
Neither can you crack a nut." (1)

اقبال نے ایمرسن کے اس خیال کو چوبیس اشعار میں پھیلا کر پیش کیا۔پہلی بار۱۹۰۴ء میں یہ نظم تمام اشعار کے ساتھ اُردو کی چھٹی کتاب میں شامل ہوئی۔بانگِ درا کی ترتیب کے وقت اقبال نے اس نظم کے بارہ اشعارحذف کر کے باقی بارہ اشعار کو مجموعے میں شامل کیا۔بانگِ درا میں شامل اشعار درجِ ذیل ہیں:

کوئی پہاڑ یہ کہتا تھا اِک گلہری سے
تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے

ذرا سی چیز ہے، اس پر غرور کیا کہنا
یہ عقل اور یہ سمجھ، یہ شعور،کیا کہنا!

خدا کی شان ہے ناچیز ،چیز بن بیٹھیں
جو بے شعور ہوں یوں با تمیز بن بیٹھیں

تری بساط ہے کیا میری شان کے آگے
زمیں ہے پست مری آن بان کے آگے

جو بات مجھ میں ہے تجھ کو وہ ہے نصیب کہاں
بھلا پہاڑ کہاں، جانور غریب کہاں

کہا یہ سُن کے گلہری نے منہ سنبھال ذرا
یہ کچّی باتیں ہیں دل سے انھیں نکال ذرا

جو میں بڑی نہیں تیری طرح تو کیا پروا
نہیں ہے تُو بھی تو آخر مری طرح چھوٹا

ہر ایک چیز سے پیدا خدا کی قدرت ہے
کوئی بڑا کوئی چھوٹا ،یہ اُس کی حکمت ہے

بڑا جہان میں تجھ کو بنا دیا اُس نے
مجھے درخت پہ چڑھنا سکھا دیا اُس نے

قدم اٹھانے کی طاقت نہیں ذرا تجھ میں
نِری بڑائی ہے، خوبی ہے اور کیا تُجھ میں

جو تُو بڑا ہے تو مجھ سا ہُنر دکھا مجھ کو
یہ چھالیا ہی ذرا توڑ کر دکھا مجھ کو

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی بُرا نہیں قُدرت کے کارخانے میں(۲)

علامہ اقبال نے جو اشعار دائرۂ انتخاب سے باہر رکھے،وہ بھی مکالمے کے حسن اور دل چسپی کے ذائقے سے معمور ہیں۔ملاحظہ ہوں حذف شدہ اشعار:

پہاڑ

ذرا سے قد پہ تجھے چاہیے نہ اترانا
کہ میرے سامنے تیرا گھمنڈ ہے بے جا

مری طفیل سے پانی ملا ہے دریا کو
دبائے بیٹھا ہوں دامن میں دشت و صحرا کو

فلک کی شان سے آنکھیں ملائے بیٹھا ہوں
بنوں کو پیٹھ پہ اپنی اٹھائے بیٹھا ہوں

اُسے جو چومتی ہیں اٹھ کے چوٹیاں میری
بلائیں لیتا ہے جھک جھک کے آسماں میری

جو برف ہے مرے سر پر بدن پہ سبزی ہے
ہری قمیص پہ گویا سفید پگڑی ہے

بڑا پہاڑ ہوں میں، شان ہے بڑی میری
کسی سے ہو نہیں سکتی برابری میری

گلہری

ذرا سی بات ہے ، انصاف سے مگر کہنا
یہ زندگی ہے کوئی اس طرح پڑے رہنا

قدم نہ اٹھے تو جینا ہے موت سے بدتر
ہزار عیب سے یہ ایک عیب ہے بڑھ کر

قلم بنا کے نہ لاتا اگر مری دُم کا
ہُنر کو اپنے مصور نہ پھر دکھا سکتا

جہاں کے باغ کی گویا سنگھار ہے ہر چیز
کہ اپنی اپنی جگہ شان دار ہے ہر چیز

نہیں کسی کو حقارت سے دیکھنا اچھا
یہ بات جس نے سمجھ لی وہی رہا اچھا

پہاڑ سُن کے گلہری کی بات شرمایا
مثل ہے وہ کہ بڑے بول کا ہے سر نیچا (۳)

[۳]

صوفی غلام مصطفیٰ تبسّم[۱۸۹۹ء تا ۱۹۷۸ء] بیسویں صدی کے معروف شاعر، ادیب، شارح، مترجم، استاد، غالب شناس ، اقبال شناس اور دانش ور تھے۔بچوں کے شاعر کی حیثیت سے انھیں بے پناہ مقبولیت ملی۔انھوں نے غالب اور اقبال کے کلام کی شرحیں لکھیں اور منتخب کلام کو پنجابی اور اُردو کے قالب میں ڈھالا۔اُردو، فارسی اور پنجابی زبانوں پر انھیں استادانہ قدرت ومہارت حاصل تھی۔تینوں زبانوں میں انھوں نے نظم ونثر کا بڑا سرمایہ یادگار چھوڑا۔صوفی تبسّم نے لاہور ریڈیو سے بے شمار پروگرام کیے۔اُن کی وفات کے بعد ان کی کئی تحریریں مختلف اصحابِ علم نے مرتب کر کے شائع کیں۔اس کے باوجود صوفی تبسّم کی کئی نگارشات اب تک غیر مطبوعہ صورت میں یہاں وہاں موجود ہیں۔ علامہ اقبال کی نظم ''ایک پہاڑ اور گلہری'' کا منظوم پنجابی ترجمہ بھی ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔یہ ترجمہ مجھے پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد قریشی[م: ۲۰۰۷ء] کے کاغذات سے محبوب عالم[اسسٹنٹ، شعبۂ اُردو] کے توسط سے حاصل ہوا۔(۴) یہ ترجمہ صوفی صاحب کا دست نوشت ہے۔ترجمے کے اختتام پر صوفی صاحب کے دستخط ہیں اور ۲۰/ اپریل ۱۹۷۴ء کی تاریخ مرقوم ہے۔میرا اندازہ ہے کہ ترجمہ اسی تاریخ کو کیا گیا اور اسی تاریخ کو ریڈیو کو فروخت کیا گیا۔نظم کے پہلے صفحے پر سرخ قلم سے Purchased لکھا ہوا ہے اور ۲۰/ اپریل ۱۹۷۴ء ہی کی تاریخ مرقوم ہے۔

صوفی تبسّم نے بانگِ درا میں شامل اشعار کو پیشِ نظر رکھا ہے۔یہ ترجمہ چودہ اشعار پر مشتمل ہے۔ پہاڑ کا مکالمہ پانچ جب کہ گلہری کا مکالمہ نو اشعار پر مشتمل ہے۔صوفی صاحب کا یہ ترجمہ شعر بہ شعر ترجمہ ہے تاہم کہیں کہیں اقبال کے مصرعے کا مفہوم بہ رنگِ دگر بھی پیش کیا گیا ہے ۔مثال کے طور پر:

''تجھے ہو شرم تو پانی میں جا کے ڈوب مرے'' کو تین مصرعوں میں یوں نظم کیا ہے:

نچّن ٹپن دا اے بڑا چا تینوں
اودھر دوڑنی ایں ، ایدھر آوَنی ایں
کیہڑی گل پچھے پیلاں پاوَنی ایں

یہ منظوم ترجمہ رواں دواں اور عام فہم پنجابی میں ہے۔یہ ترجمہ بلاشبہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کی دونوں زبانوں پر استادانہ گرفت اور مہارتِ شعری کا اظہاریہ ہے۔صوفی صاحب کا ترجمہ ملاحظہ ہو:

اِک پہاڑ گلہری نوں کہن لگا
نچّن ٹپن دا اے بڑا چا تینوں
اودھر دوڑنی ایں ، ایدھر آوَنی ایں

کیہڑی گل پچھے پیلاں پاوَنی ایں
چھوٹی ہو کے بڑی مغرور ہیں تُوں
ذرا سوچ کِنّی بے شعور ہیں تُوں
رب دی شان ناچیز وی چیز بن گئی
بے تمیز ہو کے باتمیز بن گئی
میرے جیہے تیرے وچ طور کتھے
میں پہاڑ کتھے تُوں جَور کتھے

جد ایہہ گل گلہری نے سُن لئی
آئی جوش دے وچ تے بول پئی
سُن ایہہ کیہ ویروے کھولنا ایں
کیہڑی گل پچھے مندا بولناایں
دِلوں بھیڑے خیال نوں کڈھ دیئے
چنگی گل نہ ہووے تے چھڈ دیئے
وڈا ہوویں گا، کیہ پرواہ مینوں
نِکّا بن کے ذرا وکھا مینوں
ہر شے وچ رب دیاں قدرتاں نیں
چھوٹا وڈا سبھ اوہدیاں حکمتاں نیں
رب تینوں جے وڈا بنا دِتّا
مینوں ٹہنی تے چڑھنا سکھا دِتّا
ذرا اپنی جگہ توں ہٹ تے سہی
دو تن قدم میرے نال پٹ تے سہی
میرے جیہا کوئی گُن وکھا مینوں
چھالیا توڑ کے ذرا دکھا مینوں
کوجھی شے نہیں کوئی جہان دے وچ
ہر اِک سوہنی اے اپنی شان دے وچ

حوالہ جات

۱۔ http://www.bartle.com/102/40.html

۲۔ اقبال،علامہ محمد؛ کلیاتِ اقبال (اُردو)؛ لاہور، اقبال اکادمی ، پاکستان، ششم،۲۰۰۴ء؛ ص ۴۵،۴۶۔

۳۔ صابر کلوروی، ڈاکٹر (مرتب)؛ کلیّاتِ باقیاتِ شعرِ اقبال؛ لاہور، اقبال اکادمی پاکستان؛ اوّل،۲۰۰۴ء؛ ص ۱۷۹،۱۸۰۔

۴۔ ڈاکٹر نثار احمد قریشی نے جامعۂ پنجاب سے صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ دورانِ تحقیق انھوں نے مختلف جگہوں سے صوفی تبسم کی تحریریں اور دیگر لوازمہ جمع کیا۔ یہ نظم شاید انھیں ریڈیو لاہور سے حاصل ہوئی تھی۔

ایک پہاڑ اور گلہری (اقبال)

(۱)

پنجابی ترجمہ

اک پہاڑ گلہری نوں آکھن لگا
[illegible]

اودھر دوڑدی ایں ، ایدھر آندی ایں
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

میرے جیہے تیرے جیہے ٹور گئے
میں پیار لکھے نوں جھنور گئے

جد ایہہ گل گلی دے سن لئی
آئی خوشی دے وچ تے بول پئی

میں ایہہ کیہ ہو رہے گھرلی ایں
کیہڑی گل پچھے جندا بولی ایں

دلاں بھجیاں خیال تیرا لڈا دے
جنگلی گل نہ ہووے آکھیں دے

وڈا ہو ویں گا کیہ کر دا ہوویں
تھکا ہن کے ذرا دکھا بھاویں

ہر شے دا حکم رب دیاں قدرتاں نیں

چھوڑیا ہر شے سب اپنے پیار تکاں نیں

رب تینوں جے دڑا دا دتا

تینوں عشق دے چڑھے لکھا نا

درداں دی جگہ قدم ہٹ کے سہی

دو قدم قدم ہر ناں ہٹ کے سہی

میرے جیہا کوئی نہیں وڈا تینوں

جیہا لیا تو ڈر دا دکھا تینوں

تکیا کوئی نے میں جہان دے وچ

ہر اک سوہنی دی شان دے وچ

۲۰/۷۲

میمونہ سبحانی
لیکچرر، شعبہ اردو
گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد

نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں تہذیب و ثقافت کی عکاسی

It is said that Nazeer's poetic treasure consisted of about 200,000 verses but unfortunately a bigger portion of it has been destroyed and only 6000 verses are available in printed form. He left for us about 600 ghazals, although his nazms are said to be more worthy of admiration. No other Urdu poet used as many variety of words as Nazeer did. Nazeer's poetry conveyed the plight of the common people in fact, Nazeer's growing popularity is due to his nazms. He was a "People's poet" and his nazms reflected various aspects of the daily life of his era, all types of religious and social events with containing minor details in which common people can be seen laughing, singing, enjoying, playing. He wrote nazams about religious and social festivals, such as Diwali, Holi, Eid, Shab-e-baraat, about fruits , about animals , birds, about seasons and even inanimate objects, such as paisa, rupaia, rotiyaan, atta-daal (meaning "flour" and "lentils"), "pankha" (meaning "fan") and "kakrhi" (a kind of cucumber). He wrote nazms about different aspects of human life.

انسان تنہا اس دُنیا میں سفر نہیں کرتا اس کا ماحول اس کے اردگرد کے حالات اور معاشرتی تبدیلیاں معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ادیب و شاعر اس معاشرے کا حساس طبقہ ہوتے ہیں۔ ان تبدیلیوں کو نہ صرف اپنی ذات کا حصہ بناتے ہیں۔ بلکہ ان کو اپنے اندر سموتے ہوئے ان تبدیلیوں کے ادراک کو اپنی تخلیقات کا روپ دیتے ہیں۔ یہ تخلیقات جب معاشرے کے افراد کے لیے موضوع بحث بنتی ہیں۔ تو ذاتی غم اجتماعی غم کی صورت لیے تمام لوگوں کے لیے وجہ تسکین بن جاتا ہے۔ دُنیا کا کوئی معاشرہ ایسا نہیں ہے۔ جہاں تہذیب و روایات کو ادب کا حصہ نہ بنایا گیا ہو۔ کوئی بھی معاشرہ اپنی ثقافت کے بغیر صحیح معنوں میں نہ تو وجود میں آ سکتا ہے اور نہ ہی کھڑا ہو سکتا ہے۔ شیما مجید لکھتی ہیں:

> ''ہر قوم کی ثقافت اور اس کے معیاری عناصر کا تعین اور اس کے تشخص کے مسائل ایک دوسرے سے وابستہ ہیں ۔ ہماری دانست میں ثقافت ایک ایسی ہمہ گیر اصطلاح ہے جو ہماری زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے اور اسی انسان نے ثقافت کے جوہر سے ہمارا تشخص پیدا کیا ہے۔''(۱)

اُردو زبان و ادب کی مختلف اصناف میں تہذیب کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ اُردو کی دیگر اصناف میں شاعری قدیم صنف سخن ہے۔ اور لامحالہ اس کا درجہ بہرحال بلند ہے۔ اُردو شاعری نے برصغیر کے لوگوں کی تہذیبی و ثقافتی زندگی اور جذبات کی سچی ترجمانی کی ہے۔ ڈاکٹر نجیب جمال رقم طراز ہیں:

''تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی اور مشینوں کی گڑگڑاہٹ میں یہ اُردو شاعری ہی ہے ۔ جو نہ صرف احساس کو ملاحت کا روپ عطا کرتی ہے ۔ بلکہ محبت ، وفا اور مروت جیسی اعلیٰ انسانی قدروں کی حاصل تہذیب کو زندہ کرتی ہے۔''(۲)

شاعری کی صنف انسان کی فطرت میں بھی تبدیلی لانے کا باعث بنتی ہے۔ شاعری انسان کے شعور میں تبدیلی لانے کا سبب بھی بنتی ہے ۔ اور شعور کے انقلابی عمل سے جو تبدیلی پیدا ہوتی ہے وہ سماجی زندگی کے نئے روابط بھی اپنے ساتھ لاتی ہے۔ ممتاز حسین رقم طراز ہیں:

'' اخلاقی قدروں کا وجود اسی تربیت فطرت میں مضمر ہے۔ جب تک ایک نیا نظام اپنی ترقی یافتہ قدروں کی نگہبانی نہیں کرتا اور اپنی آزاد قوتوں پر نفس پرست بادشاہوں ، امیروں اور جاگیرداروں کو قابض نہیں ہونے دیا ہے۔ اس وقت تک کلچر کے محرکات انسانی فطرت کی تعمیر میں حصہ لیتے رہے ہیں۔''(۳)

مارکسی فکری طاقتوں کو تاریخی ارتقا میں کم اہم نہیں سمجھا جاتا تہذیب کی ابتدائی منزلوں میں فنون لطیفہ نے جس طرح جنم لیا ہے اس دعوے کے ثبوت میں کہا جا سکتا ہے کہ ادب کا تعلق براہ راست زندگی سے رہا ہے۔ تخلیقی قوت کا استعمال اور آزادانہ تخلیقی سرگرمی انسان کا بنیادی منصب ہے۔ انسان تخلیقی عمل سے ہی بنیادی مسرت حاصل کرتا ہے۔ عظیم ادب یا فن پاروں کی تخلیق ہر دور میں ممکن نہیں ہوتی۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ معاشرتی حالات اور تہذیب و ثقافت ادب پر اثر انداز ضرور ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے میں جہاں جہاں فنون لطیفہ سے کام لیا گیا ہے ۔ دنیاوی فلاح و بہبود اور ترقی کی صورتیں وہاں زیادہ نظر آتی ہیں۔ شعر کی بنیاد ایسے خیال پر قائم ہونی چاہیے۔ جو ملک و قوم رنگ و نسل کے اختلاف سے گزر کر تمام نوعِ انسانی پر یکساں موثر ہو۔ شعر و ادب کی دُنیا میں نظیر اکبر آبادی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے ۔ نظیر اکبر آبادی اُردو ادب کے وہ بڑے شاعر ہیں جنہوں نے نسلی و لسانی و مذہبی تعصب کے فرق کے بغیر شاعری کی زندگی کے ہر رنگ پر نظیر اکبر آبادی نے لکھا، نظیر اکبر آبادی کا پورا نام سید ولی محمد تھا۔(۴)

نظیر اکبر آبادی اس دور میں لکھ رہے تھے جب مرزا رفیع سودا، میر تقی میر ، شیخ قلندر بخش جرات ، انشاء اللہ خاں اور غلام ہمدانی بھی لکھ رہے تھے ۔ نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں صرف گل و بلبل کا تذکرہ نہیں ملتا بلکہ نظیر زندگی کے ہر رنگ میں اپنے آپ کو رنگین کر کے قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:

'' عوام سے یہی تعلق ہے ۔ جس نے نظیر کے مطالعے کو مشکل بنا دیا ہے ، قدیم کلاسیکل نقادوں اور تذکرہ نویسوں نے عام لوگوں میں اس قدر گھلا ملا دیکھ کر سوقی اور بازاری شاعر کہہ دیا اور نئے نقادوں نے انہیں دورِ جدید کا بانی واقفیت اور جمہوریت کا علمبردار قرار دے دیا۔(۵)

نظیر اکبر آبادی کی شاعری نہ صرف ان کے عہد کی عکاسی ہے بلکہ آپ کی نظموں میں ایک تہذیبی رنگ بھی عیاں ہے۔ نظیر

اکبر آبادی فطرتاً آزاد انسان تھے۔ زندگی کے دوسرے معاملات کی طرح آپ معاشرے میں رائج کردہ قوانین سے بے نیاز تھے۔ جس دور میں نظیر اکبر آبادی نے شاعری کی یہ وہ زمانہ تھا کہ اُردو اپنے تمام مصطلحات ومحاورات کے ساتھ مکمل ہو چکی تھی۔ قانون معاشرت بھی مرتب ہو چکا تھا۔ ہندوستان کی دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان باہم متحد تھے۔ مسلمان ہندوؤں کے اور ہندو مسلمانوں کے تہواروں اور میلوں میں کشادہ دلی سے شریک ہوتے تھے۔ اس دور میں نظیر اکبر آبادی کی شاعری پروان چڑھی:

''نظیر کے یہاں قدر اور معیار کا کوئی سوال بھی سر نہیں اُٹھاتا ۔ ان کے تجربوں میں جیسی ششدر کر دینے والی بو قلمونی ملتی ہے۔ اس کی مثال اُردو سے قطع نظر دوسری زبانوں کے بڑے شاعر کے یہاں مشکل سے دکھائی دے گی۔'' **(۶)**

نظیر اکبر آبادی نے اُردو کی اشرافی اقدار سے منحرف ہو کر اپنے گردو پیش زندگی کی عکاسی کی اور ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جو دوسرے ہم عصر شعرا کے ہاں یا تو ہے ہی نہیں یا بہت کم ہے۔ وہ درحقیقت ایک عوامی شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنے موضوع کا عوام سے تعلق پیدا کیا اور ہر چیز کو عوام کے نقطہ نظر سے سوچا ، انہوں نے عوام کو کبھی نظر انداز نہ کیا، انہوں نے عوام کی ترجمانی کی تو عوام نے بھی انہیں زندہ رکھا۔ سنبل نگار لکھتی ہیں:

''ایک زمانے تک تو نظیر کے کلام کو قابل التفات ہی نہ سمجھا گیا اور جب ادھر توجہ ہوئی تو اہل نظر ایک غلط فہمی کا شکار ہو گئے ،نظیر نے عوام اور ان کی زندگی کے متعلق عوامی زبان میں بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ اس لیے انہیں عوام کا شاعر کہا گیا ہے۔ لیکن ان کے کلیات کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے خواص کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کی شاعری کا ایک حصہ فارسی آمیز زبان میں ہے پورے شعری آداب کے ساتھ تعلیم یافتہ اصحاب کے ادبی ذوق کی تسکین کا سامان اپنے پہلو میں رکھتا ہے۔ اس لیے وہ عوام اور خواص دونوں کے شاعر ہیں۔'' **(۷)**

نظیر اکبر آبادی اُردو کے ان شاعروں میں شامل ہیں جنہوں نے سادہ زبان میں اپنے جذبات و خیالات کی عکاسی کی۔ نظیر اکبر آبادی نے بھی ورڈز ورتھ کی طرح عام موضوعات پر عام زبان میں شعر کہے اور اس کا ذائقہ عوام تک پہنچایا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کا خیال ہے:

''اس حالت میں دل کے بنیادی جذبات کو زیادہ بہتر زمین میسر آتی ہے جس میں وہ پختگی اور بلوغ کو پہنچ سکتے ہیں ۔ جہاں پر کم دباؤ ہوتا ہے۔ اور جہاں وہ زیادہ صاف اور زیادہ پر زور زبان میں اپنے جذبات کا اظہار کر سکتے ہیں ۔کیوں کہ زندگی کی اس حالت میں ہمارے بنیادی احساسات زیادہ سادگی کی حالت میں ہوتے ہیں اور اس لیے زیادہ صحیح طور سے ان پر غور وفکر کیا جا سکتا ہے ۔ اور زیادہ پرزور طریقے سے ان کو ادا کیا جا سکتا ہے ۔'' **(۸)**

نظیر اکبر آبادی ایک پورے معاشرے کو کھول کر اس کے تمام رنگ ہم پر عیاں کر دیتے ہیں۔ ایک جیتی جاگتی تہذیب ، رسم و رواج اور لوگوں کا رہن سہن کھل کر ہمارے سامنے آ جاتا ہے ۔نظیر اپنے دور کے ہر قسم کے رسم و رواج ،تقریبات کو اپنی نظموں کا حصہ بناتے ہوئے، ایک تہذیب کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں اگر ہم ان کی نظموں کا جائزہ لیں تو مسلم ، ہندو وتہوار اور ہر طرح کے انداز کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔ سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

'' ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہوار مثلاً عید، بقر عید، ہولی، بسنت، دیوالی ان کی چہل پہل اور گہما گہمی میلے ٹھیلے، اژدھام، خلائق ، شوروشغب ، رنگین اور زرق برق ملبوسات، موسم برسات، موسم سرما، پھل پھول ، ترکاریاں ، مٹی کے برتن ، چھوٹے بڑے جانور اور بیسوں ایسی چیزیں اور مشاغل ، ان سب سے امن کی متخیلہ کو تحریک ہوتی ہے ۔ اور وہ ان کے ایسے موقع پیش کرتے ہیں جو حقیقت کی ترجمانی کرتے ہیں اور جن سے ان واقعات یا اشیاء کی جیتی جاگتی بولتی چالتی تصویریں سامنے آجاتی ہیں۔''(۹)

اس طرح نظیر اکبر آبادی اپنی شاعری میں اسلامی تقریبات کا ذکر کرتے ہیں جن سے اسلامی تہذیب اور رسم و رواج سے آگہی ملتی ہے ۔نظیر اکبر آبادی اپنی نظم ''شب برات'' میں لوگوں کے طور طریقوں کو بیان کرتے ہیں۔ کہ کس طرح مسلمان گھرانوں میں اس روز حلوہ پوری بنا کر محلے میں تقسیم کی جاتی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی وہ لوگ جو ان چیزوں کا اہتمام نہیں کر سکتے۔ ان کی بے بسی کو بھی نظیر اکبر آبادی بڑے خوب صورت رنگ میں پیش کرتے ہیں جہاں حلوے ، چپاتی، گیہوں اور روٹی کا ذکر کرتے ہیں وہیں شب برات پر نوجوان لڑکوں کے لڑائی جھگڑوں اور پٹاخے چلانے کی رسم کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ اس کا ذکر اپنی نظم میں یوں کرتے ہیں:

آ کر کسی کے سر پہ چھچھوندر لگی کڑی　　اُوپر سے اور ہوائی کی آ کر پڑی چھڑی
ہو گئی گلے کا ہار پٹاخے کی ہر لڑی　　پاؤں سے لپٹی شور مچا کر قلم تڑی
کرتی ہے پھر تو ایسی ستمگاری شب برات(۱۰)

ان اشعار سے پٹاخے چلانے کی رسم اور اس سے ہونے والے نقصانات کی عکاسی ہوتی ہے ۔ جو کوئی فرضی یا خیالی بات نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقی معاشرے میں لوگوں کے رسم و رواج اور تہذیب کو بیان کرتی ہے۔ مسلمانوں کی اسلامی تہذیبی تہواروں کی نشاندہی بھی نظیر کی شاعری میں نظر آتی ہے ۔ اس کی ایک مثال ''عید الفطر'' ہے۔ اس نظم میں نظیر اکبر آبادی عید الفطر پر لوگوں کی خوشی اور مسرت کا ذکر کرتے ہیں۔ کہ ایسی خوشی نہ تو بقر عید پر ہوتی ہے۔ اور نہ ہی شب برات پر جو عید الفطر پر ہوتی ہے ۔ اس نظم میں ایک پوری اسلامی تہذیب کا عکس رونما ہوتا ہے ،عید کا چاند دیکھنے پر لوگوں کے چہروں پر جس طرح مسکراہٹیں پھیلتی ہیں اس کی عکاسی اس نظم میں نظر آتی ہے :

روزے کی خشکیوں سے ہیں جو زردزرد گال
خوش ہو گئے وہ دیکھتے ہی عید کا ہلال
پوشاکیں تن میں زرد سنہری سفید لال
دل کیا کہ ہنس رہا ہے پڑائن کا بال بال
ایسی نہ شب برات نہ بقرید کی خوشی
جیسی ہر ایک کے دل میں ہے اس عید کی خوشی(۱۱)

ان تہواروں کی عکاسی کرتے ہوئے نظیر اکبر آبادی منظر کشی اتنی خوب صورتی سے کرتے ہیں کہ تمام مناظر ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ خواتین کا عید کے دن ہار سنگار کرنا عید کے حسن میں چار چاند لگا دیتا ہے ۔نظیر اکبر آبادی لکھتے ہیں:

کاجل حنا غضب مسی و پان کی دھڑی
پشوازیں سرخ سوسنی لاہی کی پھلجھڑی(۱۲)

اس طرح عیدگاہ اکبر آباد کے نام سے نظم لکھتے ہیں اور اس نظم میں نظیر اکبر آبادی عید گاہ کا منظر یوں بیان کرتے ہیں:

جھمکا ہے ہر طرف کو جو آباد لا بڑی
پوشاک میں جھمکتے ہیں سب تن ذری ذری
گلرو چمکتے پھرتے ہیں جوں ماہ و مشتری
ہے سب کے عید عید کی دل میں خوشی بھری
کیا کیا مزے ہیں عید کے آج عیدگاہ میں(۱۳)

یہ نظمیں نہ صرف اس دور کی بلکہ ہمہ گیر اسلامی تہذیب کی بھی عکاس ہیں۔ ابو سعید نورالدین لکھتے ہیں:

'' نظیر کے کلام کی ایک اور خصوصیت مقامی رنگ کی آمیزش ہے۔ ان کے ہاں برصغیر کے رسم و رواج مناظر اور مشاہیر کا کثرت سے تذکرہ ملتا ہے ۔'' (۱۴)

نظیر کے دور میں ہندو اور مسلمان اکھٹے رہتے تھے ۔ ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک ہوتے تھے۔ مذہبی فرق ہر کسی کا ذاتی مسئلہ تھا۔لیکن انسانیت کے ناتے ایک دوسرے کے خوشی اور غم میں شریک ہونا عزت کا باعث سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے نظیر کی شاعری میں دونوں مذہب ہندو اور مسلم کے تہذیبوں اور تہواروں کی عکاسی بہت خوبی سے نظر آتی ہے:

''He wrote nazams about religious and social as Diwali, Holi, Eid, Shab-e-barat about animals and birds about seasons and even innamate objects, such as paisa, rupaia and rotiyaan.''(۱۵)

نظیر اکبر آبادی کی نظم ''بسنت'' سے اندازہ ہوتا ہے کہ بسنت کو اس دور میں باقاعدہ تہوار کے طور پر منایا جاتا تھا۔ سب اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں کے ساتھ مل کر اہتمام کرتے تھے۔ بسنت کے موقع پر سرسوں کے رنگ کی پوشاکیں سلوائی جاتیں ،عطر کے موتی (چمبے کا عطر ہوتا تھا) اس کے کڑے بنائے جاتے تھے۔ اور باقاعدہ بسنت کی ایک انجمن بنائی جاتی تھی۔نظیر نے اپنی نظم بسنت میں اسے بیان کر کے ایک مکمل تہذیبی رنگ اور ہر قسم کے انداز اور لوگوں کے تقریبات کے حوالے سے تیاریوں ان کے مزاج اور طور اطوار سب کو اپنے اشعار میں سمو دیا ہے:

مل کر صنم سے اپنے ہنگام دل کشائی
ہنس کر کہا یہ ہم نے اے جا بسنت آئی
سنتے ہی اس پری نے گل گل شگفتہ ہو کر
پوشاک زرفشانی اپنی ووہیں رنگائی(۱۶)

نظیر اکبر آبادی نے اپنی نظموں میں نہ صرف اسلامی تہذیب اور معاشرتی تقریبات کا ذکر کیا ہے بلکہ ہندو تہذیب اور ہندوؤں کے رسم و رواج اور ان کی روایات کا ذکر بھی کرتے ہیں۔نظیر اکبر آبادی نے ہندوؤں کی ایک رسم ہولی کے نام سے کئی نظمیں کہیں جو ہندوؤں کی تہذیب کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ ہولی کی تقریب میں ہندو ایک دوسرے پر رنگ پھینکتے ہیں:

خوشی کی دھوم میں ہر گھر میں رنگ بنوائے
گلال عبیر کے بھر بھر کے تھال رکھوائے
نشوں کے جوش ہوئے راگ رنگ ٹھہرائے
جھمکتے روپ کے بن بن کے سوانگ دکھلائے(۱۷)

نظیر اکبر آبادی اپنے دور کی تہذیب کے معمار ہیں۔آپ نے تمام تہذیبی عناصر کو اپنی نظموں کا حصہ بنا کر ہمیشہ کے لیے امر کر دیا ہے۔اسی طرح نظیر اکبر آبادی کی نظم ''دوالی کا سامان'' بھی ایک مکمل تہذیب کو لیے ہوئے ہیں۔اس میں نظیر اکبر آبادی بیان کرتے ہیں کہ کس طرح دوالی کا دن سب کے لیے خوشی کا باعث بنتا ہے اور دیوالی کا دن بہار کی مانند ہوتا ہے۔ جو سب کے لیے خوشیاں لے کر آتا ہے ۔اس لیے تیاریاں ہوتی ہیں۔ جو اس دور کی تہذیب کی عکاس ہیں۔اس کے بارے میں نظیر لکھتے ہیں:

جہاں میں یارو عجیب طرح کا ہے یہ تیوہار — کسی نے نقد لیا اور کوئی کرے ہے ادھار
کھلونے کھیلوں بتاسوں کا گرم ہے بازار — ہر اک دکاں میں چراغوں کی ہو رہی ہے بہار
سبھوں کو فکر ہے اب جا بجا دوالی کا (۱۸)

نظیر اکبر آبادی بلاشبہ ایک ذہین شخص تھے۔آپ عید، شب برات ، ہولی اور دیگر تہواروں پر خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ ہندو و مسلم کی تفریق رکھے بغیر سب کے مذہبی عقائد سے عقیدت رکھتے تھے۔عقیدت کا اظہار صرف تخیل کی حد تک نہیں ملتا، بلکہ روزمرہ کی زندگی اس کی کشمکش اس کا تضاد اس کے تجربات کی بنیاد پر ملتا ہے۔محمد گل عباس کا خیال ہے:

''ان کے کلام کے مطالعے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ عید صرف مسلمانوں کا نہیں بلکہ سماج کے ہر طبقے کا تہوار ہے اور ہولی صرف ہندو ہی نہیں کھیلتے بلکہ سب لوگ اس میں شریک نظر آتے ہیں وہ سہادیو کا ساہ ہو، بلاپوجی کا میلہ ہو کہ کرن جی کا ان ہر نظم کے لیے جہاں دیوالی راکھی رسم کتھا بیان نرسی اوتارور گاجی کے درشن بھیروں کی تعریف اور

کتھیا جی کا جنم سب نظم کے سانچے میں ملتے ہیں۔''

ہیں کہتے نازک شاہ جنہیں وہ پورے ہیں آگاہ گرو
وہ کامل رہبر جگ میں ہیں یوں روشن جیسے ماہ گرو
اس بخشش کے اس عظمت کے ہیں بابانانک شاہ گرو
سب سیس نوا ارداس کرو اور ہر دم بولو واہ گرو**(۱۹)**

نظیر نے ہندو اور مسلم مذہب کا توازن اپنی شاعری میں اس طرح قائم رکھا ہے ۔کہ بڑے سے بڑا مذہبی عالم بھی ان کی شاعری یا ان کی مذہبی عقیدت پر اعتراض نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر کی شاعری مذہبی تنگ نظری سے ہمیشہ دور رہی ہے۔ ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا اس بارے میں لکھتے ہیں:

''نظیر کی یہی افتادِطبع اسے کامل مذہبی بےتعصبی سکھاتی ہے۔جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ ہندو اور مسلمانوں کے تہواروں کو ہو بہو پیش کر دیتا ہے۔''**(۲۰)**

آپ خود عوام کا حصہ تھے ۔اس لیے اس عمل میں شریک رہے ۔آپ کی اکثر نظمیں عوام کی فرمائش پر لکھی گئیں، ان میں عید، بقر عید، ریچھ کا تماشا ، آدمی نامہ، ہنس نامہ، روٹی، بنجارہ نامہ، برسات، بہاریں ، الٰہی نامہ اور انجام جیسے عنوانات پر طویل نظموں کا ایک سلسلہ ملتا ہے۔ ان عنوانات پر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ یہ عنوانات خود عوامی شاعر کی دلیل ہیں۔ ریاض صدیقی رقم طراز ہیں:

'' ان نظموں میں اس عہد کی پوری ثقافتی تاریخ در آتی ہے۔مسلمان مورخوں کی درسی کتابوں اور اساتذہ کے تذکروں میں برصغیر کے عوام ان کی تاریخ و تہذیب اور مسائلِ معاشرت کا کوئی پہلو موجود نہیں ہے۔۔۔اردو شاعری کی تاریخ میں صرف نظیر ہی ہیں جنہوں نے اس تاریخ و تہذیب کو سمیٹ کر محفوظ کیا ہے۔علم البشریات ، ساجیات ، تاریخ اور لسانیات پر تحقیقی کام کرنے والوں کو جن ماخذ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان میں حکیمات نظیر سب سے اہم ہے۔ کلیات نظیر کو برصغیر کی ثقافتی تاریخ کہا جا سکتا ہے ۔''**(۲۱)**

نظیر کی نظموں کے ذریعے ہمیں اس دور کی جیتی جاگتی تصویریں ملتی ہیں۔ جو ہر تہذیبی رنگ کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ ''بلبلوں کی لڑائی'' ،''گلہری کا بچہ'' اور'' ریچھ کا بچہ'' ،'' کبوتر بازی'' جیسے موضوعات پر مبنی نظمیں ہر طرح سے تہذیب کا احاطہ کیے ہوئے ہیں:

ہیں عالم بازی میں جو ممتاز کبوتر
اور شوق کے طائر سے ہیں انداز کبوتر

بھاتے ہیں بہت ہم کو یہ طناز کبوتر
مدت سے جو سمجھیں ہمیں ہمراز کبوتر
پھر ہم سے بھلا کیوں کہ رہیں باز کبوتر(۲۲)

نظیر کی شاعری کا سب سے اہم موضوع انسان سے محبت ہے۔ ڈاکٹر نجیب جمال نظیر کی انسان دوستی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

'' ان کی عید، شب برات ، ہولی اور دیوالی جیسے تہواروں کے بارے میں نظمیں عوام دوستی کا مظہر ہیں۔نظیر کی ان نظموں میں تعصب سے نفرت اور انسانوں سے محبت کا موضوع عام ملتا ہے،نظیر کی رواداری کا یہ عالم ہے کہ وہ انسانی غلطیوں پر بھی مسکراتے اور چشم پوشی کرتے نظر آتے ہیں۔حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی شاعری پڑھ کر انسانیت پر یقین بڑھ جاتا ہے۔ اور انسانوں سے محبت اور ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے ۔''(۲۳)

اسلوبیاتی اور لسانی حوالے سے کلیات نظیر اپنی مثال آپ ہے۔لیکن جمالیاتی تناظر بھی نظیر کی شاعری میں بے حد وسیع ہے۔ نظیر کی شاعری کی تہذیب عجمی اور مغل تہذیب تک محدود ہے۔ ریاض صدیقی رقم طراز ہیں:

'' ان کے عقائد کی روایات اور ثقافتی صورتیں مختلف رنگ زاویے پیش کرتے ہیں۔ ان کی زمین اور موسم مختلف ہیں۔ لیکن یہ تمام اختلافات اجتمائی سطح پر ایک ایسی وحدت کا رنگ بھی پیش کرتے ہیں۔ جو خوب صورت مشرق کا رنگ ہے۔کلیاتِ نظیر اسی رنگ سے مالا مال ہے۔''(۲۴)

نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں عوامی موضوعات بہت زیادہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری تہذیب کے اثرات لیے ہوئے ہے۔نظیر اکبر آبادی نے لوگوں کے دکھ بانٹے ، ان کے دکھوں کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی۔ ہمیشہ برابری اور مساوات کا درس دیا۔ ہندوستانی تہذیب وتمدن کو نمایاں کیا اور اپنے عہد کو اپنی شاعری میں سمو دیا۔ انسانی دوستی سے نظیر کو بہت محبت تھی۔ اور شاید یہ عہد نظیر کی انسان دوستی کی وجہ سے بہت خوب صورت نظر آتا ہے۔ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے بقول:

'' نظیر ہر اعتبار سے عوامی شاعر ہیں کہ انہوں نے یہاں عوام کی نظر و نیاز اور پھول چڑھانے کی ان رسموں کا بھی ذکر کر دیا ہے جن کا مذہب میں جواز ہو یا نہ ہو عوام کے عقیدے میں دخل ضرور تھا۔''(۲۵)

نظیر کی شاعری کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے ۔کہ نظیر کی شاعری انسان دوستی اور تہذیب وتمدن کا مرقع ہے۔نظیر پر ناقدین کا جو اعتراض تھا کہ وہ عام زبان میں شاعری کرتے ہیں اور بازاری لوگوں کا دل خوش کرتے ہیں۔ اعتراض ان کی شاعری کی صفت بن گیا، مقامی جذبات ،مذہبی تعصب اور فرقہ وارانہ جھگڑوں سے نظیر کی شاعری پاک ہے۔ ناصر سلطان کاظمی رقمطراز ہیں:

''ان کی شاعری کے عام موضوعات پیرائیہ اظہار اس تہذیب کے اثرات اور یہاں کے مقامی رنگ لیے ہوئے ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ نظیر اکبر آبادی اردو کا پہلا باقاعدہ عوامی شاعر ہے۔ ان کی بعض نظمیں مثلاً ''بنجارہ''، ''آدمی نامہ''، ''شب برات''، ''روضہ تاج گنج''، ''بچپن'' وغیرہ ہماری لوک شاعری کا حصہ بن چکی ہیں۔'' **(۲۶)**

نظیر کی شاعری نے ایک بڑے خطہ ارضی کے لوگوں کی ترجمانی کی ہے۔نظیر کی شاعری کے آئینے میں ہم آج بھی عوام کے جذبات اور محسوسات کا عکس تلاش کر سکتے ہیں۔نظیر کی شاعری ان کی سیرت اور زمانے کی مکمل عکاس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظیر اکبرآبادی کی شاعری تہذیبی اور انسانی قدروں کے کھو جانے کی سب سے بڑی نوحہ خواں دکھائی دیتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ شیما مجید، فیض احمد فیض اور پاکستانی ثقافت (مرتبہ) کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر، ۲۰۰۶ء، ص۱۳

۲۔ نجیب جمال، ڈاکٹر، اُردو شاعری کی تہذیب، (امیر خسرو سے غالب تک) بہاولپور: جزیرہ تحریر، ۲۰۰۷ء، ص ۱۱

۳۔ ممتاز حسین، نقد حیات، الہ آباد: ہاؤس، ۱۹۵۰ء، ص۲

۴۔ احتشام حسین، سید، ذوق ادب اور شعور، الہ آباد: س۔ن

۵۔ نظیر اکبر آبادی ۱۷۳۵ء میں آگرہ میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد کا نام سید محمد فاروق تھا۔نظیر کے بچپن اور جوانی کا ابتدائی حصہ بہت ہی خوشی اور مسرت کے جھمیلوں میں گزرا۔نظیر کی جائے پیدائش کے متعلق دو متضاد روایتیں ملتی ہیں۔کہ آپ کا وطن دہلی تھا۔لیکن نادرشاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے بعد دہلی چھوڑ کر آپ نے آگرہ میں سکونت اختیار کی۔ خارجی شواہد کی عدم موجودگی کے باعث قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا۔کہ ان میں سے کون سی روایت صحیح ہے۔لیکن یہ درست ہے کہ نظیر دہلی میں ہی پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم کا حال معلوم نہیں البتہ ان کی کلیات کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں فارسی ادب پر خاصا عبور حاصل تھا۔ فارسی ادب پر نظیر کی دسترس سے اس امر کی تائید ہوتی ہے۔کہ ان کا ذریعہ معاش درس و تدریس رہا۔انہیں فارسی ادب پر اچھا خاصا عبور حاصل تھا۔

۶۔ شمیم حنفی، تاریخ، تہذیب اور تحقیقی تجزیہ، دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۳ء، ص۵۳

۷۔ سنبل نگار، اردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ، علی گڑھ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، ۲۰۰۸ء، ص۲۲۲

۸۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، ارسطو سے ایلیٹ تک، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۵ء، ص۲۴

۹۔ وقار عظیم، سید، تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند، ساتویں جلد (اردو ادب دوم) ۱۷۰۸ تا ۱۸۰۳، لاہور: پنجاب یونیورسٹی، ص ۸

۱۰۔ نظیر اکبر آبادی، کلیات نظیر، مرتبہ: مولانا عبدالباری آسی، مکتبہ شعر و ادب، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۴۱۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۶۱۸

۱۲۔ ایضاً، ص ۴۶۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۴۴۰

۱۴۔ نورالدین، ابوسعید، تاریخ ادبیات اردو، جلد دوم، ص ۵۸۶

۱۵۔ www.wikipediaara/wiki/nazeerakbarabadiandnootrv.

۱۶۔ کلیات نظیر، ص ۴۲۴

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۲۵

۱۸۔ ایضاً، ص ۴۴۱

۱۹۔ محمد گل عباس اعوان، ڈاکٹر، اردو میں انسان دوستی: عثمان پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۵

۲۰۔ محمد زکریا، ڈاکٹر، نئے پرانے خیالات، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۲۵

۲۱۔ ریاض صدیقی، جب لاد چلے گا بنجارہ: نفیس اکیڈمی، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۴۲۔۴۱

۲۲۔ کلیاتِ نظیر، ص ۶۷۲

۲۳۔ نجیب جمال، ڈاکٹر، اردو شاعری کی تہذیب (امیر خسرو سے مرزا غالب تک)، ص ۹۲

۲۴۔ ریاض صدیقی، جب لاد چلے گا بنجارہ، ص ۴۳

۲۵۔ ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر، نظیر اکبر آبادی ان کا عہد اور شاعری: اردو مرکز، لاہور، ۱۹۶۷ء، ص ۴۷

۲۶۔ ناصر کاظمی، انتخاب نظیر، مرتبہ: ناصر سلطان کاظمی: جہانگیر بک ڈپو، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۱۱

ڈاکٹر محمد افضال بٹ
شعبہ اردو،
الخیر یونیورسٹی بھمبر (اے، جے، کے)

دبستانِ تحقیق لاہور کا روشن ستارہ حافظ محمود شیرانی

Hafiz Mahmood Khan Sheerani's important position as a researcher does not need any introduction in urdu and literature circles. In the research capital of Eastern Sciences in Punjab University, the tradition of research and editing text was established under the supervision of scholars and scholars and papers of high quality Eastern sciences and literature were written, among them Hafiz Mahmood Sheerani, Dr. Syed Abdullah and Dr. Waheed Qureshi are also named.

حافظ محمود خان شیرانی کا بطور محقق اہم وممتاز مقام اردو زان وادب کے حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ پنجاب یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے تحقیقی سرمائے میں فضلا اور علماء کی نگرانی میں تحقیق وتدقیق اور تدوین متن کی روایت قائم ہوئی اور اعلیٰ پائے کے مشرقی علوم وادبیات کے مقالے لکھے گئے ان میں حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وحید قریشی کا نام بھی درخشاں وتابندہ ہے۔

''ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقالہ ''ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ'' ان چند مقالات میں سے ہیں جن کی اشاعت کے بعد پنجاب یونیورسٹی کے تحقیقی سرمائے کی دھاک بیٹھ گئی۔''(۱)

پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور میں معاشرتی، سیاسی اور سماجی پس منظر کو مخطوطہ شناسی میں شامل کیا گیا۔ واقعات اور سنین بنیادی ثانوی ماخذوں کی صحت وتنقید پر زور دیا گیا۔_

''حافظ محمود شیرانی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر محمد اقبال اور ڈاکٹر وحید قریشی جیسے نام یہیں سے برآمد ہوئے۔''(۲)

تحقیق کے دبستانِ لاہور میں جہاں بہت سے محققین کے نام سامنے آئے ان میں ڈاکٹر تبسم کاشمیری کا نام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ سابقہ تحقیقی سرمائے میں اردو کے بڑے محققین کی درجہ بندی کرنے پر بھی اہل علم کی توجہ مبذول ہوئی۔ رسالہ ''آج کل'' دہلی کے شمارہ اگست ۱۹۶۷ء میں ''اردو تحقیق کے چار چناصر'' قاضی عبدالودود، امتیاز علی فرشی، مسعود حسین رضوی اور مالک رام کو قرار دیا گیا ہے۔

''ڈاکٹر گیان چند نے اپنی کتاب تحقیق کا فن میں حافظ محمود شیرانی کو ان میں شامل کر کے انہیں ''اردو تحقیق کے عناصرِ خمسہ'' کہا ہے۔ اگر اردو کی تحقیقی روش اور تتبع کا اصولوں کے حوالے سے جائزہ لیں تو ان میں پہلے

درجے پر حافظ محمود شیرانی ہی خائز نظر آتے ہیں۔''(۳)

اردو میں تحقیق کی روایت تقریباً ایک صدی پرانی ہے۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں حالی، شبلی اور آزاد کے جدید تحقیقی کارناموں کے بعد بیسویں صدی میں یہ تحقیقی روایت مزید آگے بڑھی، اعظم گڑھ، پٹنہ، لاہور، دکن، دلی اور لکھنو جدید تحقیق کے مراکز بنتے گئے۔ ڈاکٹر تبسم کاشمیری تحقیق کے مراکز کو دبستانِ قرار دیتے ہیں۔ ان مختلف تحقیقی دبستانوں میں مختلف نوعیت کا کام کیا گیا۔ ڈاکٹر مظہر محمود شیرانی لکھتے ہیں:

''اہل علم اس بات سے اتفاق کریں گے کہ لاہور کے دبستانِ تحقیق وتدریس کے سلسلے الذہب کی تین کڑیاں بالترتیب پروفیسر حافظ محمود شیرانی، پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللہ اور پروفیسر ڈاکٹر وحید قریشی ہیں۔''(۴)

تحقیق کرتے وقت آپ کو نامعلوم کے ذریعے معلوم کی طرف قدم بڑھانا ہوتا ہے۔ اردو میں ادبی تحقیق کا آغاز بیسویں صدی سے ہوا اور کسی تکلیف کے بغیر شیرانی صاحب کو اردو تدوین وتحقیق کا معلمِ اول کہا جا سکتا ہے۔

''شیرانی صاحب نے قدیم مشرقی اندازِ تعلیم اور جدید مغربی اندازِ نظر، دونوں سے فیض پایا تھا۔ مزاجاً ان کو تحقیق سے مکمل مناسبت تھی اور ان کے یہاں وہ منطقی اندازِ نظر موجود تھا۔ جس کے بغیر، اندازِ گفتگو میں صحت اور استخراج نتائج کا سلیقہ آ ہی نہیں سکتا۔ تحقیق اور تدوین دونوں موضوعات پر ان کا بیشتر کام، مثال ومعیار کی حیثیت رکھتا ہے۔''(۵)

لاہور کا ادبی مرکز اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی میں قائم تا۔ ابتدا میں عربی، فارسی اور سنسکرت کو تحقیقی کام کے لیے منتخب کیا گیا۔ بعد ازاں اردو زبان وادب پر کام شروع ہو گیا۔ اس مرکز نے لاہور میں اردو زبان وادب کی تحقیقی روایت میں مزم واختیاط کا بہترین معیار پیش کیا۔

''یہاں سے وابستہ اہل تحقیق نے فراموش شدہ مصنفین کے حالات کی تلاش، عام اور مسلمہ ادبی مفروضوں کی بے رحمانہ چھان بین، تمام معلومہ مواد کو برج اور تعدیل کی کسوٹی پر پرکھنا، حوالے کے قلم بند کرنے میں کامل احتیاط کو اپنا نصب العین قرار دیا۔ ان کا قابل فخر اور اہم کام یہ ہے کہ ادبی تحقیق میں محنت کو تحقیق کے لیے ایمان کا درجہ دیا۔ سہل نگاری کو سرے سے رد کر دیا۔''(۶)

لاہور کے اس ادبی وتحقیقی مرکز میں صاحبانِ تحقیق نے ادبی تحقیق کا معیار متعین کیا اسے عملی طور پر تحقیقی اصولوں کے مطابق برتا۔

''جن محققین نے اس مرکز میں اردو ادب میں تحقیق کی راسخ روایت قائم کرنے اور ادبی تحقیق کا معیار بلند کرنے میں اپنا کردار ادا کیا، ان میں مولوی محمد شفیع اور حافظ محمود شیرانی نہایت اہم شخصیات ہیں۔''(۷)

حافظ محمود شیرانی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اردو دانوں میں متن کی صحت کا احساس اور شعور پیدا کیا۔ آپ نے ادبی دنیا میں اقسام اور مفروضات کے پچاسوں بت توڑے ہیں۔ شیرانی مرحوم نے اردو، فارسی زبان وادب کے سینکڑوں

موضوعات پر اچھوتا مواد فراہم کیا۔ ان کی حیثیت اردو زبان وادب میں تحقیق کی روایت میں تاریخ ساز محقق اور نقاد کی ہے۔

''بلاشبہ شیرانی مرحوم کی تحقیق راہ ہدایت کی شمع ہے انہوں نے موجودہ نسل کے لیے بہت کافی سامان اکٹھا کر دیا ہے۔ ان کے اور ان کے رفقا کے ذریعے تحقیق کی ایک زبردست روایت قائم ہو چکی ہے۔''(۸)

حافظ محمود شیرانی کی تحقیق ہے کہ خالقاباری ۱۰۳۱ھ میں عہد جہانگیری میں لکھی گئی اس سے اصل صنف ضیا الدین خسرو ہیں۔ آپ نے اس عہد کی سیاسی، سماجی اور مذہبی تاریخ کا مطالعہ کیا۔ خالق باری ایک طویل زمانے تک امیر خسرو سے منسوب رہی ہے۔ شیرانی نے اپنے دعوے کے ثبوت میں بہت سی شہادتیں پیش کی ہیں۔ خالق باری کا شعر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''دانگ فلوس جو آہے پیکا حیتل ومڑا جان
دام واچہ کسیہ کھسیہ جان میکش تان

اس شعر میں ''دام اور دمڑا الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ یہاں ''دام'' اور ''دمڑا'' جن کا رواج اکبری عہد میں شروع ہوتا ہے قابل غور ہیں۔''(۹)

حافظ محمود شیرانی نے تنقید شعرالعجم، فردوسی پر چار مقالے، پرمتوی راج داسو وغیرہ بھی تصنیف کیں۔

''اردو تحقیق میں ان کا سب سے بڑا کانامہ امیر خسرو کو دو تصانیف سے بے دخل کرنا ہے۔ مفت مفت کرم داشتن کے بمصداق قصہ چہار درویش کو امیر خسرو کی تصنیف قرار دیا جاتا تھا۔ شیرانی نے رسالہ کاروان ۱۹۳۳ء میں مضمون لکھ کر شافی طریقے پر ثابت کر دیا کہ یہ قصہ خسرو سے بہت بعد کا ہے۔ لیکن انھوں نے عہد محمد شاہی کے محمد معصوم علی خان کو جو اس کا مصنف ٹھہرایا وہ بھی صحیح نہ تھا۔''(۱۰)

حافظ محمود شیرانی نے اردو کی جنم عبومی کے سلسلے میں اپنا سب سے مشہور نظریہ ''پنجاب میں اردو'' ۱۹۸۲ء میں پیش کیا۔ اس سے پہلے نصیر الدین کاشمی کی کتاب ''دکن میں اردو'' شائع ہو چکی تھی۔

''محمود شیرانی کی یہ کتاب لسانی تحقیقات کے ٹھہرے پانی میں ایک بھاری پتھر ثابت ہوئی اور لسانیات کے محل میں یہ ایسی آواز تھی جس کی بازگشت آج تک سنی جاتی ہے۔ دراصل پنجاب میں اردو کی بحث کا آغاز شیرانی سے نہیں ہوتا۔ کیونکہ انیسویں صدی کے اواخر سے ہی اردو زبان وادب کے سلسلہ میں پنجاب کی اہمیت اور خدمات کو جتلانے اور جھٹلانے کا قصہ شروع ہو چکا تھا۔''(۱۱)

پنجاب/ لاہور کی ادبی خدمات سے انکار ناممکن ہے۔ جو اردو ادب کا مطالعہ کرنے پر واضح ہو جاتا ہے۔

''۱۸۵۷ء کے بعد اردو کی ترویج وادب کی اشاعت کا سب سے بڑا اور اہم مرکز پنجاب کا دل لاہور قرار پایا تھا۔''(۱۲)

محمود شیرانی نے ''پنجاب میں اردو'' کے پیش لفظ (عرضِ حال) میں اعجاز سخن کے حوالے اس بات کا اعتراف کیا ہے

کہ اہل قلم نے بیسویں صدی میں پنجاب میں اردو کے مسئلے پر سوچنا اور لکھنا شروع کیا۔ ربع صدی میں لکھنے والوں میں سے کسی کے پاس نہ تو شیرانی سا لسانیات کا رچا ہوا مذاق تھا نہ تحقیقی ذہن۔

''شیرانی نے مخطوطات اور نادر کتب جمع کرنے میں ایک کم صرف کی تھی۔ سو ان کے لیے اپنی تحقیقات کی تکمیل کے لیے خام مواد کی کمی نہ تھی۔''(۱۳)

حافظ محمود شیرانی اپنے مقالے میں یہ استدلال دیتے ہیں کہ محمود غزنوی (۱۰۳۰.....۱۹۹۷) کے حملوں سے مسلمانوں کا پنجاب سے رابطہ شروع ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی خاصی تعداد یہاں آباد ہو گئی بعد ازاں ۱۱۹۳ء میں قطب الدین ایبک نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ تو پہلی مرتبہ مسلمانوں نے پنجاب سے باہر قدم نکالے۔ مسلمانوں کے باہمی ربط، مقامی بولی نے فارسی اور پنجابی کے ساتھ ملاپ کر لیا۔ صوفیاء کی تبلیغی سرگرمیاں، مذہبی، سیاسی، ثقافتی ہر لحاظ سے پنجابی اور فارسی باہم آمیز ہوتی گئیں۔

''جس نے اس بولی کی صورت اختیار کی جو بالآخر زبان اردو کہلائی۔''(۱۴)

''پنجاب میں اردو'' کا نظریہ شیرانی ہی کے الفاظ میں کچھ یوں ہے:

''یہ بات ہم کو یاد رکھنی چاہیے کہ امیر خسرو دہلی کی زبان کو دہلوی کہتے ہیں۔ ابوالفضل بھی آئین اکبری میں اس کو ''دہلوی'' کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اب شیخ باجن (متوفی: ۹۱۲ھ) بھی اس کو دہلوی کہتے ہیں اور جو نمونہ اس زبان کا دیتے ہیں وہ قطعاً اردو ہے۔''(۱۵)

حافظ محمود شیرانی کی تصانیف کی تعداد بے شمار ہیں۔ حالق باری کے بارے میں تحقیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ خالق باری کے متعدد نسخے نوشتہ پنجاب میری نظر سے گزرے ہیں جو سو ڈیڑھ سو سال پہلے کہ نوشتہ ہیں۔

''اس صوبے میں خالق باری کی مقبولیت کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ پنجاب کے نصابی لٹریچر پر اس کا بے حد اثر ہے۔ اس کی تقلید میں نصاب لکھے جاتے ہیں، بلکہ نام بھی اس طرز کے اختیار کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ ذیل کی کتب کے نام بہ تقلید ''خالق باری'' رکھے گئے ہیں۔

(۱) واحد باری، (۲) راز قاباری، (۳) ایزدباری، (۴) اللہ باری، (۵) ناصر باری، (۶) صنعت باری، (۷) قادر باری، (۸) واسع باری، (۹) رحمت باری، (۱۰) اعظم باری، (۱۱) صادق باری، (۱۲) اللہ باری، (۱۳) رازق باری و دیگر۔

پنجاب زبان کے سب سے پہلے نصاب یعنی ''واحد باری'' میں ایسے آثار موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ''خالق باری'' کی ممنون ہے حتی کہ ''خالق باری'' کے مصرعے اور شعر تک اس میں داخل کر لیے گئے ہیں۔''(۱۶)

آپ نے قدرت اللہ قاسم کے ضخیم تذکرے ''مجموعہ نغز'' کو نہایت حسن و خوبی سے ترتیب دیا اور بڑا عالمانہ مقدمہ

لکھا۔ ان مضامین کو مقالات حافظ محمود شیرانی کے نام سے مجلس ترقی ادب لاہور نے ۱۹۶۶ء میں قریب ۶ جلدوں میں شائع کیا۔ اسلامیہ کالج کی ملازمت کے دوران دو تحقیقی کام سرانجام دیئے۔

''تنقید شعرالعجم'' اور ''پنجاب میں اردو'' آپ کے مایہ ناز کارنامے و تحقیقی نگارشات ہیں۔ بقول فتح ملک:

''پنجاب کی مادری زبان اردو ہے'' کے موضوع پر بحث بالآخر ۱۹۲۸ء میں حافظ محمود شیرانی کی عہد آفریں کتاب ''پنجاب میں اردو'' کی اشاعت تکمیل کو پہنچی۔ حافظ محمود شیرانی نے لسانی تحقیق کے جدید سائنسی اصولوں کی روشنی میں یہ حقیقت روشن تر کر دی کہ اردو کا مولا پنجاب ہے۔''(۱۷)

اورینٹل کالج میں ملازمت کے دوران تحقیق وتالیف کا سلسلہ جاری رہا۔ ان کے متفرق مضامین: ''ترجمہ خزائن الفتوح''، ''پرتھی راج راسا کی''، پرتھی راج راسا اور مولانا محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' پر تنقیدی مضامین کا سلسلہ سامنے آیا۔ اورینٹل کالج میگزین، کاروانِ لاہور اور غالب امرتسر میں بھی مضامین شائع ہوتے رہے۔

حافظ محمود شیرانی کا بطور محقق ایک ایسا مزاج اور فطرت تھی کہ جس میں کھوج اور استدلال کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ بغیر دلیل یا تحقیق کے کوئی بات کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اردو میں تحقیق کا بے بہا خزانہ چھوڑا ہے۔ بقول شمس اللہ صدیقی:

''محمود شیرانی کی اولین حیثیت فارسی اور اردو ادب کے مورخ اور محقق کی ہے۔ ان کا علمی کام زیادہ تر تحقیق زبان اور تحقیق واقعات سے متعلق ہے۔''(۱۸)

رشید حسن خان کو اردو کا پہلا محقق تسلیم کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''ارد میں تحقیق کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز سے ہوتا ہے اور کسی تکلف کے بغیر، شیرانی صاحب کو اردو میں تدوین وتحقیق کا معلم اول کہا جا سکتا ہے۔ شیرانی صاحب نے قدیم مشرقی اندازِ تعلیم اور مغربی اندازِ نظر دونوں سے فیض پاتا تھا، مزاجاً ان کو تحقیق سے مکمل مناسبت تھی۔''(۱۹)

حافظ محمود شیرانی نے دقیق نظری سے امیر خسرو کی طرف منسوب خالق باری کے جعلی انتساب کا پردہ چاک کیا ہے۔ وہ تحقیقی دنیا کا شاہکار تھے۔ حقیقتاً حافظ محمود شیرانی ایک روایت شکن محقق ہیں۔

''شیرانی فطرتاً تحقیق کے والدادہ تھے جو مسئلہ ان کے سامنے ہوتا اس کے معاملے میں محض حافظے یا علم پر بھروسہ نہ کرتے بلکہ اس کی خوب تحقیق اور چھان پھٹک کرتے۔''(۲۰)

انہوں نے بہت سی تحقیقی غلطیوں کو درست کیا۔ ڈاکٹر خلیق انجم لکھتے ہیں:

''خالق باری، پرتھوی راج راسا پر ان کے مضامین ادبی تحقیق کے اعلیٰ ترین نمونے ہیں۔ شیرانی صاحب کا ایک بڑی تحقیقی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے بعض تحقیقی کتابوں پر تبصرے کر کے غلطیوں کی نشاندہی اس طرح کی ہے کہ تحقیق کے بنیادی اصولوں کی وضاحت ہوگئی۔''(۲۱)

حافظ محمود شیرانی نے عروض کی تشکیل نو کے حوالے سے بھی نہایت قابل قدر کام کیا ہے اوزان دریافت کیے، تدوین اور تنقیدِ متن کے حوالے سے بھی اہم کام سرانجام دیئے۔

ڈاکٹر خلیق انجم رقمطراز ہیں:

''اردو کا پہلا محقق ہونے کا شرف حافظ محمود شیرانی کو حاصل ہے۔ انہوں نے تنقید شعر العجم لکھ کر محققین میں میں ذمہ داری کا احساس پیدا کیا۔ حکیم قدرت اللہ خان قاسم کے تذکرے ''مجموعہ نغز'' کا تنقیدی ایڈیشن تیار کر کے متنی تنقید کا قابل تقلید نمونہ پیش کیا۔''(۲۲)

حافظ محمود شیرانی کی شخصیت کے تمام پہلو شاندار تھے۔ کوئی بھی شعبہ ہو ان کی تحریر سے ان کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ میں گونا گوں خوبیاں تھیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ فرماتے ہیں:

''وہ بے نظیر استاد اور بے مثل مدرس تھے، وہ بے عدیل محقق، اعلیٰ پائے کے مورخ اور عالی مرتبہ نقاد تھے۔''(۲۳)

حافظ محمود شیرانی نے اپنی اسلامیہ کالج کی تدریس کے دوران ہی ''پنجاب میں اردو'' مکمل کر دی تھی۔ جس کے محرک علامہ اقبال تھے۔ یہ حافظ محمود کا معرکتہ الآرا تحقیقی ولسانی اہمیت کا حامل کام ہے۔ جس نے اردو تحقیق ولسانیات میں بحث کے کئی دریچے ادا کر دیے ہیں۔ بقول گیان چند:

''۱۹۲۸ء میں حافظ محمود شیرانی کی کتاب پنجاب میں اردو شائع ہوئی۔ اس کی اہمیت تاریخ وتحقیق کے لحاظ سے بہت کم اور لسانی تحقیق کے لحاظ سے بہت زیادہ ہے۔''(۲۴)

حافظ محمود شیرانی ''پنجاب میں اردو'' کی تحقیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایسٹ انڈیا کمپنی سنہ ۱۸۴۶ء میں جو ۱۲۶۲ھ کے مطابق ہے، پنجاب پر قابض ہو جاتی ہے۔ اس عہد میں اردو کو پنجاب میں سرکاری حیثیت مل جاتی ہے۔''(۲۵)

حافظ محمود شیرانی کی تحقیقی وتنقیدی تصانیف میں اہم ترین ''پنجاب میں اردو''، تبصرہ برخزائن الفتوح امیر خسرو، فردوسی پر چار مقالے، تنقیدِ شعر العجم، تنقید پر تھی۔ راج راسا، خالق باری، مقالات شیرانی (دس جلدیں)، مکاتیب حافظ محمود شیرانی، مجموعہ نغز، دیوانِ غالب۔ نسخہ شیرانی وغیرہ شامل ہیں۔

حافظ محمود شیرانی نے مخطوطات اور مسکوکات کا ایک نادر ذخیرہ اکٹھا کیا ہوا تھا۔ نسخہء شیرانی بھی اس ذخیرے میں شامل ایک مخطوطہ ہے جو کہ تاریخی حیثیت اور قدر ومنزلت کا حامل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ وحید قریشی، ڈاکٹر، پیش لفظ، مشمولہ: اردو زبان وادب میں متشرقین کی علمی خدمات کی تحقیقی وتنقیدی جائزہ (از

۱۴۹۸ء تا ۱۹۴۸ء) لاہور، مکتبہ خیابانِ اردو، طبع اول، ۱۹۸۵ء، ص:۱۷

۲۔ عطش درانی، ڈاکٹر، جدید رسمیات تحقیق، لاہور، اردو سائنس بورڈ، طبع اول، ۲۰۰۵ء، ص:۱۳

۳۔ ایضاً، ص:۱۴

۴۔ مظہر محمود شیرانی، ڈاکٹر، حافظ محمود شیرانی اور ان کی علمی وادبی خدمات، لاہور، مجلس ترقی ادب، جلد اول، طبع اول، جون ۱۹۹۳ء، ص:۱۷۔۱۸

۵۔ رشید حسین خان، تدوین اور تحقیق کے رجحانات، مشمولہ: اردو میں اصول تحقیق، ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اسلام آباد، ورڈ ویژن پبلشرز، طبع چہارم، ۲۰۰۱ء، ص:۲۸۲

۶۔ ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اردو ادب میں تحقیق کی روایت، مشمولہ: اردو میں اصول تحقیق، ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر، اسلام آباد، ورڈ ویژن پبلشرز، جلد اول، طبع چہارم، ۲۰۰۱ء، ص:۳۸۶۔۳۸۷

۷۔ ایضاً، ص:۳۸۷

۸۔ ایضاً، ص:۳۸۹

۹۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، تیاری اور مواد کی فراہمی، مشمولہ: اردو میں اصولِ تحقیق، ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر اسلام آباد، ورڈ ویژن، پبلشرز جلد اول، طبع چہارم، ۲۰۰۱ء، ص:۳۱۷

۱۰۔ گیان چند، ڈاکٹر، اردو کی ادبی تحقیق، آزادی سے پہلے، مشمولہ: اردو میں اصول تحقیق، ایم سلطانہ بخشڈاکٹر اسلام آباد، ورڈ ویژن پبلشرز، جلد دوم، طبع چہارم، ۲۰۰۱ء، ص:۱۷۴

۱۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ (غاز سے ۲۰۰۰ء تک)، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۰ء، ص:۷۰

۱۲۔ ایضاً، ص:۷۰

۱۳۔ ایضاً، ص:۷۳

۱۴۔ ایضاً، ص:۷۴

۱۵۔ ایضاً

۱۶۔ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو کا ایک فراموش شدہ ورق، مشمولہ: پاکستانی ادب، تنقید، رشید امجد، فاروق علی، مرتبین، راولپنڈی، فیڈرل گورنمنٹ سرسید کالج، طبع اول، جنوری ۱۹۸۲ء، ص:۱۶۳

۱۷۔ محمد اشرف کمال، ڈاکٹر، حافظ محمود شیرانی۔ احوال وآثار، پاکستان، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول، ۲۰۱۰ء، ص:۹

۱۸۔ شمس اللہ صدیقی، ڈاکٹر، تحقیق وتنقید، مشمولہ: تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان وہند، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، جلد دہم، ۱۹۷۲ء، ص:۱۹۳

۱۹۔ رشید حسن خان، ادبی تحقیق مسائل اور تجزیہ، الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب، ۱۹۸۹ء، ص:۱۰۷

۲۰۔ شیخ عبدالقادر، حافظ محمود شیرانی، مشمولہ: اورینٹل کالج میگزین، حصہ اول، لاہور، جلد ۲۳، عدد مسلسل ۸۸، فروری ۱۹۴۷ء، ص:۱۰۳ (شیرانی نمبر)

۲۱۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، قاضی عبدالودود سے قبل اردو تحقیق اور مقفّی تنقید، مشمولہ: تعبیر وتفہیم، نئی دہلی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۶ء، ص:۱۰۳

۲۲۔ خلیق انجم، ڈاکٹر، محمود شیرانی کا قیام لندن میں، مشمولہ: تعبیر وتفہیم، نئی دہلی، مکتبہ، جامعہ لمیٹڈ، ۱۹۹۶ء، ص:۱۱۴

۲۳۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، کتب خانہ، شیرانی کے نودار، مشمولہ: فارسی زبان وادب، لاور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۷ء، ص:۳۴۸

۲۴۔ گیان چند، ڈاکٹر، محمود شیرانی سے میرے استفادات، مشمولہ: ارمغانِ شیرانی، مرتبہ: رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، زاہد منیر عامر، لاہور، پنجاب یونیورسٹی، ۲۰۰۲ء، ص:۲۴

۲۵۔ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو کی بعض قدیم تصنیفات، مشمولہ: پنجاب میں اردو، حافظ محمود شیرانی، مرتبہ: محمد اکرام چغتائی، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۵ء، ص:۳۵۴

انڈیکس (Index)

نمبر شمار	مقالہ نگار	مقالے کا عنوان	موضوع
۱	ڈاکٹر عطش درانی	علمیات اور زبانوں میں تحقیق	یہ مقالہ اردو اور پاکستانی زبانوں کی تحقیق میں علمی فلسفہ یا علمیات کے ممکنہ استعمال سے متعلق ہے۔ ابھی تک وجودیات، علمیات اور طریقیات کے حوالے سے پاکستانی زبانوں میں اصول تحقیق کے جدید طریقہ کار اور اس کی مختلف اصطلاحات کے حوالے سے بات کی گئی ہے تاکہ ہمارے علمی اضافے میں نئی تکنیک اور واضح نتائج کی اہمیت معلوم ہوسکے۔
۲	ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر	دبستانِ سیال شریف کا ملفوظاتی ادب: ایک تعارفی مطالعہ	اس مقالے میں سیال شریف کی خانقاہ سے وابستہ نایاب ملفوظات کا تعارف و جائزہ شامل ہے۔ ان ملفوظاتی کتب میں سیالِ شریف اور اس کے فیضِ نسبت سے آباد خانقاہوں میں تخلیق ہونے والے ادب کا تعارفی جائزہ مرتب کیا گیا ہے۔
۳	ڈاکٹر ناصر عباس نیر	اردو میں مغربی تنقید کی نصابی کتب	اردو میں مغربی تنقید کا ربط و ضبط ثقافتی، نصابی اور دانس ورانہ سطحوں پر ہوا۔ اس اریخی ترتیب نے مغربی تنقید کے مخصوص متن اور اس کی خصوصی تعبیر کو اردو میں رائج کیا۔ بیسویں صدی کے شروع میں بھی مغربی تنقید سے نصابی ضرورت کے تحت اخذ و ترجمہ کا سلسلہ جاری رہا۔ ہمارے نقادوں نے کہیں تو بغیر حوالہ براہ راست ترجمہ کرلیا اور کہیں حوالے دیدیے۔ اس مقالے میں اس سارے اخذ و ترجمے کا جائزہ لیا گیا ہے۔
۴	ڈاکٹر سہیل عباس	اُردو نصاب: آزادی سے پہلے	مسلمانوں کی علمی خدمات سے کسی کو انکار نہیں انھوں نے جو علمی نظریات پیش کیے وہ جدید علوم کی بنیاد ہیں۔ زوالِ بغداد کے بعد مسلمانوں کی علمی دنیا میں جو زوال آیا اس میں مسلمان حکمرانوں کا بھی بڑا کردار ہے۔ اس مضمان میں مسلمانوں کی علمی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے برصغیر میں نو آبادیاتی دور کی اردو نصابی کتابوں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔

۵	ڈاکٹر محمد ارشد اویسی	نفاذ اُردو کے لیے قانون سازی (1897ء-1997ء)	نفاذ اردو کے لئے مختلف اوقات میں پنجاب اسمبلی کے اراکین نے مسودات قانون پیش کئے۔ اس مقالے میں ایسے نو بلوں کی تفصیل شامل ہے جو اردو کے نفاذ کے لیے اسمبلی میں پیش ہوئے ان پر ہونے والی بحث اور دیگر مراحل کا ذکر تفصیل سے اس مقالے میں شامل ہے۔
۶	ڈاکٹر محمد اشرف کمال	اُردو شاعرات ۱۸۵۷ء سے پہلے: ایک نسوانی تاریخ	ابتداء ہی سے مردوں کے ساتھ ساتھ خواتین شعرا بھی اپنی پہچان کراتی رہی ہیں۔ اردو میں بھی یہ روایت قائم رہی ہے۔ اس مقالے میں ۱۸۵۷ء سے پہلے کی اردو شاعرات کا تذکرہ کرتے ہوئے شاعرات کی نسوانی تاریخ مرتب کی گئی ہے۔
۷	ڈاکٹر رابعہ سرفراز	جمالیات کیا ہے؟	جمالیات ادب و فلسفہ دونوں سے متعلق اس مقالے میں جمالیات کے تعارف اور مختلف فلاسفروں کے نقطہ ہائے نظر کو بیان کیا گیا ہے۔
۸	سید کامران عباس کاظمی	اردو میں مضمون نگاری کی روایت	اردو میں مضمون نگاری کا آغاز انگریزی ارات سے ہوا۔ سرسید عہد سے آج تک مضمون ایک اہم ادبی صنف ہے۔ اس مقالے میں انگریزی زبان میں مضمون کے آغاز و ارتقاء کے مختصر ذکر کے ساتھ ساتھ اردو میں مضمون نگاری کی روایت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔
۹	ڈاکٹر تبسم کاشمیری	منٹو کی وجودی اخلاقیات	منٹو اردو افسانے کا اہم نام ہے وہ اپنے عہد کی فکری و ذہنی تحریکوں سے باخبر تھے۔ موضوعات کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں فنی تنوع بھی موجود ہے۔ منٹو کے افسانوں کی ایک بلند جہت انسان کی تلاش ہے۔ اس مقالے میں انسان کی دریافت کے مرحلے کو وجودی اخلاقیات کے حوالے سے جاننے کی کوشش کی گئی ہے۔
۱۰	ڈاکٹر قاضی عابد/ ڈاکٹر محمد افضال بٹ	ادب اور بقائے باہمی: تین کہانی کار (کرشن چندر، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین)	اس مقالے میں اردو افسانے میں بقائے باہمی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مقالہ نگار نے اردو کے تین اہم افسانہ نگاروں کرشن چندر، قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے افسانوں میں ایسے پہلوؤں کو تلاش کیا ہے جو بقائے باہمی کے حوالے سے اہم ہیں۔

۱۱	ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد	"ایک پہاڑ اور گلہری" کا غیر مطبوعہ منظوم پنجابی ترجمہ از صوفی تبسم	اپنے ابتدائی دور میں علامہ اقبال نے کچھ انگریزی نظموں کے تراجم کیے تھے۔ ان میں ایک نظم " ایک پہاڑ اور گلہری" بھی تھی۔ اس نظم کو صوفی تبسم نے پنجابی میں ڈھالا لیکن یہ ترجمہ منظر عام پر نہ آسکا۔ اس مقالے میں پہلی بار یہ ترجمہ پیش کیا جارہا ہے۔
۱۲	میمونہ سبحانی	نظیر اکبر آبادی کی شاعری میں تہذیب و ثقافت کی عکاسی	نظیر اکبر آبادی ایک اہم شاعر ہیں جنہوں نے اپنی نظموں میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کی عکاسی کی ہے۔ اس مقالے میں ان کی مختلف نظموں میں اس عکاسی کا جائزہ لیا گیا ہے۔
۱۳	ڈاکٹر محمد افضال بٹ	دبستانِ تحقیق لاہور کا روشن ستارہ حافظ محمود شیرانی	اس مقالے میں حافظ محمود شیرانی کے حوالے سے ان کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اردو زبان و ادب کے حلقوں میں ان کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انہوں نے اردو زبان و ادب میں دبستانِ تحقیق لاہور میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے ان کا یہ کام آج بھی تحقیق میں اہم مقام رکھتا ہے۔

Contents

• Research on knowledge & Linguistics	Dr. Attish Durani
• An Introduction of Sial Sharif's Malfuzaty Literature	Dr. Abdul Aziz Sahir
• Influence of text books of western criticism in Urdu	Dr. Nasir Abbas Nayyer
• Urdu curriculum: Before Independence	Dr. Sohail Abbas
• Legislation for the implementation of Urdu (1897-1997)	Dr. Muhammad Arshad Awaisi
• Urdu Poetesses before 1857: A feminine History	Dr. Muhammad Ashraf Kamal
• What is Aesthetics?	Dr. Rabia Sarfraz
• Tradition of essay writing in Urdu	Sayed Kamran Abbas Kazmi
• The existential morality of Manto	Dr. Tabassam Kashmeri
• Literature & co-existence: Three short story writers: (Krishn Chander,Quratul ain Haider, Intizar Hussain)	Dr. Qazi Abid/ Dr. Muhammad Afzal Butt
• ''A mountain & squirrel'':An un-published Punjabi translation by Sufi Tabassum	Dr. Arshad Mehmood Nashad
• Cultural reflections in the poetry of Nazir Akbar Abadi.	Memoona subhani
• Hafiz Mahmood Sheerani, Bright star of Dabastan-e-Tahqeeqh Lahore	Dr. Muhammad Afzal Butt
• Index	Muhammad Sajid Nizami

Research Journal

Tahqeeqi Zawiay

1

July – Dec 2013

Department of Urdu & Pakistani Languages
Al- Khair University
Camp Office
Islamabad
ISSN2309-0499

Patron –in- Chief: Dr. Muhammad Bashir Goraya, Pro Chancellor.
Patron: Dr. A.Q. Ansari, Rector
Publisher: Prof. Muhammad Imtiaz Aqdas
Editors: Dr. Inam-ul-Haq Javeid,
Dean Faculty of Social Sciences.
Dr. Rasheed Amjad,
Head Department of Urdu & Pakistani Languages

Advisory Board: (National)

- Dr. Khawaja Muhammad Zakria, Professor Emeritus, Punjab University, Lahore.
- Dr. Tabasaum Kashmiri, Visiting Professor, G.C. University, Lahore.
- Dr. Muhammad Fakhrul Haq Noori, Chairman Urdu Department, University Oriental College, Lahore.
- Dr. Rubina Tareen, Dean & Head, Urdu Department Zakaria University, Multan.
- Dr. Muhammad Yousaf Khushk, Head Urdu Department, Shah Latif University, Khair pur Sindh.
- Dr. Najeeb Jamal, Head Urdu Department, International Islamic University, Islamabad.
- Dr. Abdul Aziz Sahir, Head Urdu Department, Allama Iqbal Open University, Islamabad.
- Dr. Rubina Shahnaz, Head Urdu Department National University of Modern Languages, Islamabad.
- Dr. Naheed Qamar, Urdu Department, Wafaqi Urdu University, Islamabad.

Advisory Board (International)

- Dr. Abu-al-Kalam Qasmi, Urdu Department, Ali Garh Muslim University, India.
- Prof. Qazi Afzal Hussain, Urdu Deparment, Ali Garh Muslim University, India.
- Dr. Sagheer Afraheem, Urdu Department, Ali Garh Muslim University, India.
- Dr. Muhammad Q. Marsi, Head Urdu Department, Tehran University, Iran.
- Dr. Jalal Sedan, Chairman Urdu Department, Ankara University, Turkey.
- Dr. Sohail Abbas, Tokyo University of Foreign Studies, Japan.

For Contact: Department of Urdu & Pakistani Languages.
Al-Khair University, IJP Road, Opposite Grid Station I-8, Islamabad.

Circulation Incharge: M.Sajid Nizami- Asghar Abid
Title: Zulfiqar Ahmed **Layout:** M. Abrar Siddiqui, Muhammad Ali
Email: tzurdu@hotmail.com **Website**: www.alkhair.edu.pk

ISSN2309-0499

TAHQEEQI ZAWIAY

No. 1 Jan.June 2013

Department of Urdu & Pakistani Languages

Al-Khair University Bhimber

Camp office

IJP Road Opp. I-8 Grid Station Islamabad

ISSN 2309-0499